مئی ۱۹۹۰ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
حِکَم و عِبَر (قرآن کالج۔ تحریکِ رجوع الی القرآن کا اہم سنگِ میل)	ڈاکٹر اسرار احمد	۳
ہدایت القرآن (۳۸)	مولانا محمد تقی امینی	۶
تذکیر بالقرآن	مولانا سید اخلاق حسین قاسمی	۱۱
کتاب 'رجوع الی القرآن' پر ایک نظر	پروفیسر حافظ محمد فاضل	۲۹
لُغات و اعرابِ قرآن (۱۲)	پروفیسر حافظ احمد یار	۴۳
تعلیم و تعلّمِ قرآن (قرآن کالج میں صلوٰۃ کیمپ کا قیام)	لُطف الرحمٰن خان	۵۹

مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور

ایف اے / ایف ایس سی اور بی اے / بی ایس سی کے امتحانات سے فارغ طلبہ کے

فارغ اوقات کا بہترین اور بامقصد مصرف!

۱۹ مئی ۱۹۹۰ء سے قرآن کالج لاہور میں مذکورہ بالا طلبہ کے لیے

۱۵ ہفتوں پر مشتمل ایک دینی معلوماتی کورس

کا آغاز ہو رہا ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل مضامین کی تدریس ہوگی ان شاء اللہ

۱۔ نماز و قراءت قرآن کی تصحیح ۲۔ عربی گرامر

۳۔ سیرت النبیؐ و مطالعہ دینی لٹریچر ۴۔ قرآنِ حکیم کے منتخب اسباق

۵۔ تاریخِ جمع و تدوینِ حدیث ۶۔ تعارف و ترجمۂ قرآن

نوٹ:

- اس کورس میں رجسٹریشن کی آخری تاریخ ۷ ارمئی ہے۔
- اوقاتِ تعلیم صبح ۸ بجے سے دوپہر ایک بجے تک ہوں گے۔
- کورس فیس مبلغ -/۵۰۰ روپے ہے جس میں جملہ کتب اور کورس میٹریل کی قیمت شامل ہے۔ (مستحق طلبہ کے لیے رعایت کی گنجائش ہوگی)
- تدریس کا آغاز ۱۹ ارمئی سے ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ۔

المعلن: ناظم قرآن کالج لاہور۔ ۱۹۱ ار اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن

زیرِ اہتمام: مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماھنامہ

حکمتِ قرآن

لاھور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدّین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ۔ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

معاون امور انتظامی: حافظ خالد محمود خضر

جلد: ۹ | مئی ۱۹۹۰ء ۔ شوال المکرم ۱۴۱۰ھ | شمارہ: ۵

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاھور ۱۴۔ فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: داؤد منزل متصل شادی کیمپ۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون ۴۰/- روپے ۔ فی شمارہ ۴/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

حرفِ اوّل

لاہور بورڈ نے میٹرک کے نتائج کا اعلان کر دیا ہے ۔ ملک بھر کے دوسرے علاقوں سے بھی میٹرک کے نتائج کا اعلان آج کل میں متوقع ہے۔ اندازہ ہے کہ بہت جلد اخبارات میں مختلف کالجوں کی جانب سے 'اعلان داخلہ' کے اشتہارات نظر آنے لگیں گے۔ پروگرام یہ ہے کہ دوسرے کالجوں کے ساتھ ہی قرآن کالج میں ایف اے کلاسز کے لیے داخلوں کا آغاز بھی کر دیا جائے گا۔

پچھلے سال داخلے کے اُمیدوار طلبہ کی تعداد ہماری توقع سے زائد تھی۔ چنانچہ ایف اے کلاس کو دو حصّوں (SECTIONS) میں تقسیم کرنا پڑا تھا۔ اگرچہ قرآن کالج کے حصّے میں جو طلبہ آئے وہ بحیثیتِ مجموعی قابلیت اور ذہنی استعداد کے اعتبار سے اوسط درجے سے قدرے کم ہی قرار پائیں گے ، تاہم وہ کلاس 'جوہر قابل' سے بالکل خالی بھی نہ تھی ۔ ہمارا عزم تو یہ ہے کہ ہم ان شاء اللہ کالج میں وہ ماحول مہیّا کرنے کی پوری کوشش کریں گے کہ طلبہ میں کم و بیش جو صلاحیت و استعداد بھی ہو وہ پورے طور پر نکھر جائے اور ہر اس طالب علم کو جو پڑھائی کے معاملے میں کچھ بھی سنجیدہ ہو، ساز گار ماحول میسّر آسکے ۔ الحمد للہ کہ پچھلے تعلیمی سال کے دوران ہم اپنی اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب رہے ہیں ۔ اور نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کو دیگر اہم دینی معلومات پہنچانے کی بھی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ اس ضمن میں 'دو روزہ صلوٰۃ کیمپ' کا معاملہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس کی اجمالی رپورٹ اسی پرچے میں شامل ہے۔

قارئینِ 'حکمتِ قرآن' اور جملہ وابستگانِ انجمن سے گزارش ہے کہ وہ قرآن کالج کی آئندہ ایف اے کلاس کے لیے اپنے گھروں میں اور اپنے اپنے حلقۂ احباب میں ان طلبہ کو ہدف بنا کر قرآن کالج میں داخلے پر ذہناً آمادہ کریں جنہوں نے حال ہی میں میٹرک کا امتحان دیا ہو ۔ اور جیسا کہ مرکزی انجمن کے صدر مؤسّس نے اپنے خطابِ عید میں فرمایا تھا کہ اپنے اُن بچّوں کو دینی تعلیم کے لیے وقف کریں جو زہین اور باصلاحیت ہوں۔ تبھی دعوت رجوع الی القرآن کا کام آگے بڑھ سکے گا۔

قرآن کالج

تحریکِ رجوع الی القرآن کا ایک اہم سنگِ میل

اِس بار عید الفطر کے موقع پر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے صدر مؤسس اور امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مسجد دار السلام باغ جناح میں اپنے مختصر مگر جامع خطاب میں جہاں موجودہ ملکی سیاسی صورتِ حال پر اجمالاً اظہارِ خیال فرمایا وہاں بعض دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ قرآن کالج اور اس کی غرضِ تاسیس کو بھی موضوعِ سخن بنایا۔ خطاب کا متعلقہ حصہ اس صراحت کے ساتھ ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے کہ یہ خطاب مکمل شکل میں تازہ 'میثاق' کی زینت بن چکا ہے۔ ادارہ

اس وقت مجھے آپ سے یہ عرض کرنا ہے کہ میٹرک کے امتحان کا نتیجہ اب نکلنے والا ہے۔ ہم نے قرآن کالج بنایا۔ کیوں بنایا کہ کچھ نوجوان ایسے ہوں جو قرآن کے پڑھنے پڑھانے کو اپنا مشن بنالیں۔ بلکہ ابتداءً تو ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ والدین ایسے ہوں جو اپنی اولاد کو وقف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اور وہ بات نہیں ہونی چاہئے کہ جس کی طرف سورۃ البقرہ میں ' انفاق فی سبیل اللہ ' کی بحث میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ تم اللہ کے نام پر وہ مال نکالو جو بالکل ردّی ہو اور از کار رفتہ ہونے کے باعث تمہارے دل سے اتر گیا ہو۔ ہمارا عام دستور بھی یہی ہے کہ اس بچے کو خدمتِ دین یا تعلیمِ دین کے لئے وقف کرتے ہیں جو اور کسی کام کا نہ ہو' جو ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے سب بچوں میں کمتر ہو۔ ہمارے زوال کے اسباب میں ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ دین اور دینی تعلیم کو ہم نے یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ جب تک اچھے کھاتے پیتے گھرانوں کے چشم و چراغ اور باصلاحیت نوجوان اس کام میں نہیں لگیں گے حالات کے رخ میں کوئی دیرپا اور مثبت تبدیلی

نہیں آئے گی - میں پچھلے ۲۵ برس سے اس شہر لاہور میں دعوتِ قرآنی کا فریضہ انجام دے رہا ہوں - اس مسجد (دارالسلام) میں خدمت انجام دیتے اب چودھواں برس ہونے کو آیا ہے - آپ سب اس پر گواہ ہیں کہ میں نے یہاں کبھی آپ سے چندے کی اپیل نہیں کی - کبھی کوئی پیسہ نہیں مانگا' کبھی آنے جانے کا کوئی خرچ بھی طلب نہیں کیا - الحمدللہ کہ یہ سب خدمت اللہ کے لئے ہے - لیکن اب میں آپ سے 'چندہ' مانگ رہا ہوں کہ آپ اپنی اولاد میں سے وہ بچہ اللہ کے دین اور تعلیمِ قرآن کے لئے وقف کیجئے جو بہترین صلاحیتوں کا مالک ہو - تاکہ ایسے بچوں کو ہم دین سکھائیں' قرآن پڑھائیں' ساتھ ساتھ ایف اے اور بی اے کی نصابی تعلیم کا اہتمام بھی کریں - انہیں فلسفہ' معاشیات اور سیاسیات پڑھائیں - ہمیں ایسے بچے تیار نہیں کرنے جو صرف دین کے ذریعہ روٹی کمانے والے ہوں' ہمیں ایسے دیندار اور صاحبِ فہم نوجوان تیار کرنے ہیں جو اپنے لئے کسی باوقار پروفیشن کا انتخاب کریں' خواہ وہ قانون کے شعبے کو اختیار کریں' خواہ Competition کی لائن کو اپنے لئے منتخب کریں اور خواہ Teaching Profession کا انتخاب کریں اور کسی کالج یا یونیورسٹی میں تدریسی شعبے سے منسلک ہو جائیں - میں پہلے بھی کسی موقع پر آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہندوؤں نے ایک زمانے میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی (Servants of India Society) کے نام سے ایک ادارہ بنایا تھا اور اس کا اصول یہ بنایا تھا کہ ان میں صرف وہ شامل ہوں گے جو (۱) کبھی سرکاری ملازمت نہیں کریں گے - ذہن میں رکھئے وہ انگریز کا دور تھا! (۲) صرف قومی اداروں میں ملازمت کریں گے اور پروفیشن بھی صرف معلمی (Teaching) کا اختیار کریں گے - اور (۳) یہ کہ ساری عمر بچھتر روپے سے زائد تنخواہ نہیں لیں گے - یہ ہندو قوم کی عظمت کی دلیل ہے کہ سینکڑوں لوگ اس سوسائٹی سے وابستہ ہوئے اور انہوں نے تمام عمر ان اصولوں کی پابندی کی -

امریکہ میں عیسائیوں کے ایک فرقے مورمنز (Mormans) کے بارے میں بھی اس سے قبل میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ انہوں نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ان کا جو بچہ ہائی

اسکول تک تعلیم مکمل کرلے گا' واضح رہے کہ ان کا ہائی اسکول بارہ برس کا ہوتا ہے' پھر اس کے دو برس محض دین کے لئے اور دینی تعلیم کے لئے مخصوص رہیں گے - ایک سال ان کی تعلیم ہوگی اور دوسرے سال میدان میں جاکر کام کریں گے - دو سال دین کے لئے لگانے کے بعد ان کے لئے موقع ہوگا کہ وہ اپنے کسی دنیاوی کیریر میں پیش رفت کر سکیں - لیکن آج ہم اللہ کے نام لیوا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا کس حال میں ہیں؟ اور مجھے زیادہ صدمہ ہوتا ہے ان لوگوں کے حال پر جو برس ہا برس سے میرے دروسِ قرآن میں شریک ہو رہے ہیں ' رجوع الی القرآن کے کام میں اپنی صلاحیّت و استعداد کے مطابق میرے ساتھ تعاون بھی کرتے ہیں لیکن جب بچوں کو کالج میں داخل کرانے کا مرحلہ آتا ہے تو ادھر کا رخ نہیں کرتے ان کے لئے گویا محمدٌ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کوئی وزن نہیں رکھتا کہ "خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ" - تم میں بہترین وہ ہے جو قرآن پڑھے اور پڑھائے - ہمارا حال یہ ہے کہ ہر ڈاکٹر یہ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا بھی ڈاکٹر بنے اور انجینئر کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بیٹا انجینئر ہونا چاہئے - خدا کے لئے سوچئے' اس ملک کے لئے ضرورت ہے' دین کے لئے ضرورت ہے' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کی عاقبت کے اعتبار سے یہ انتہائی نفع بخش سودا ہے کہ آپ اپنے بچے کے لئے اس کیریر کا انتخاب کریں جسے نبی اکرمؐ نے بہترین قرار دیا ہے - کیا عجب کہ یہ بچہ آپ کی آخرت کے لئے توشہ بن جائے - اگر آپ لے بچے دین کے لئے کام کریں گے تو جب تک ان کے اس نیک کام کے اثرات دنیا میں رہیں گے' آپ کا کھاتہ اللہ کے یہاں کھلا رہے گا - اور اس میں نیکیوں کا اندراج ہوتا رہے گا - ابھی چونکہ وقت ہے کہ آپ خود کو اور بچے کو اس مبارک کام کے لئے ذہناً آمادہ کر سکتے ہیں لہٰذا آپ کو یاددہانی کرا دی ہے - یہ بات جان لیجئے کہ میرا کسی کے ساتھ اصل تعلّق چاہے قریبی رشتہ دار ہوں' دین کے حوالہ سے ہے - مجھے تو اُسی سے پیار ہے کہ جو دین کے لئے کام کرنے کو تیار ہے - میرا روئے سخن اپنے ساتھیوں کی جانب بھی ہے اور بالخصوص اپنے اعزّہ و اقارب کی جانب ہے کہ اس جانب توجّہ دیں اور اپنے بچوں کو اس کام کے لئے تیار کریں -

■■

مولانا محمد تقی امینی

احرام کے بعد حج کے احکام

روزہ کی طرح حج کا حکم بھی پہلے سے موجود تھا، لیکن لوگوں نے اس پر عمل درآمد میں رکاوٹیں ڈال رکھی تھیں۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔ جن احکام پر لوگ عمل کرتے تھے ان کو اپنی مرضی سے بگاڑ رکھا تھا، جن کی اصلاح کی ضرورت تھی۔ قرآن نے حکم و احکام کے سلسلہ میں صرف بنیادی باتوں کے بیان کرنے ہی پر اکتفاء کیا ہے۔ حج کی رہبری کے لیے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف فرما تھے، جو حج کی تفصیلات سے واقف کراتے تھے۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ
الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۭ فَمَنْ
كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ
صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۠ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ
فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ
فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ
يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ
الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ
خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي
الْاَلْبَابِ ۝ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ
فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠
وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ۝
ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ

اللهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٩٩﴾ فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللهَ كَذِكْرِكُمْ
آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا
وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾ وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا
فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾
أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾ وَاذْكُرُوا
اللهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ
وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَاتَّقُوا اللهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ
إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٠٣﴾

(البقرہ : ۱۹۶ تا ۲۰۳)

اور اللہ کے لیے حج اور عمرہ پورا کرو پھر اگر رک جاؤ تو جو قربانی میسّر ہو (اسے پیش کرو) اور جب تک قربانی اپنی جگہ (حرم) نہ پہنچ جائے اس وقت تک اپنے سر نہ منڈاؤ (احرام نہ کھولو) البتہ اگر کوئی تم میں بیمار ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہو تو روزوں سے یا صدقہ سے یا قربانی سے فدیہ دے کر (احرام کھول دے) پھر جب تم امن میں ہو تو جس نے عمرہ سے حج تک فائدہ اٹھایا ہے وہ جو قربانی میسّر ہو وہ کرلے قربانی کی سہولت نہ ہو تو تین روزے حج کے دنوں میں رکھو اور بقیہ سات روزے جب تم واپس ہو۔ اس طرح دس پورے ہو گئے۔ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو مکہ کا رہنے والا نہ ہو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے[1]۔

حج کے مہینے (شوال ذیقعدہ ذی الحجہ) معلوم ہیں۔ جو کوئی ان میں حج اپنے اوپر لازم کرلے تو نہ بیوی سے ملتا ہے اور نہ گناہ و نافرمانی کرتا ہے اور نہ لڑائی جھگڑا کرتا ہے۔ اور تم جو بھی نیکی کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔ اور زادِ راہ (سفر خرچ) لے لیا کرو، اور بہترین زادِ راہ پرہیزگاری ہے۔ اے عقل والو مجھ ہی سے ڈرو۔ تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ اپنے رب کا فضل (روزی) تلاش کرو۔ پھر جب تم عرفات سے لوٹو تو مشعرِ حرام (مزدلفہ) کے پاس اللہ کو یاد کرو اور اس کی یاد اس طرح کرو جس طرح کی یاد اس نے تمہیں بتائی ہے۔ اور اس سے پہلے تو تم

گمراہی میں تھے۔ پھر تم لوٹ کر آؤ جہاں (عرفات) سے لوگ لوٹ کر آتے ہیں اور اللہ سے بخشش مانگو، بیشک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔ پھر جب تم حج کے احکام ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو جیسے تم اپنے باپ دادا کو یاد کیا کرتے تھے، یا اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔ پھر بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا ہی میں دیدے اور اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔ یہی وہ لوگ ہیں، جن کے لیے ان کی کمائی کا پورا حصہ ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے[۳] اور اللہ کو چند گنتی کے دنوں (۱۰ سے ۱۳ تک) میں یاد کرو۔ پھر جس نے دو دن کے اندر کوچ کرنے میں جلدی کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور جو تاخیر کرے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، جو اللہ سے ڈرتا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ تم اسی کی طرف جمع کیے جاؤ گے[۴]

---

[۱] حرم میں قربانی پہونچنا اور پھر احرام کھولنا اس حالت میں ہے جبکہ قربانی وہاں پہونچائی جاسکتی ہو۔ ورنہ جس جگہ روکا گیا ہے وہیں قربانی ذبح کر دی جائے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر کیا تھا۔

باہر کے لوگوں کے لیے یہ رخصت ہے کہ حج کے دنوں میں وہ عمرہ اور حج دونوں کرلیں۔ پہلے عمرہ کا احرام باندھ کر اس کے فرائض ادا کریں۔ پھر حج کا احرام باندھ کر حج کریں، اس کو حج تمتع کہتے ہیں۔ حرم کی حدود میں رہنے والوں کے لیے اس کی اجازت نہیں ہے۔

[۲] عرب نے حج کو تجارتی میلہ بنا رکھا تھا، حج مقصود نہ رہ گیا تھا۔ اب بھی تجارت کرنے کی اجازت ہے، لیکن مقصود حج ہے خالص عبادت کے موقع پر تجارت کی اجازت سے یہ بتانا ہے کہ جس کو لوگ خالص دنیوی کاروبار سمجھتے ہیں وہ بھی عبادت ہے بشرطیکہ نیت درست ہو اور اللہ کی نافرمانی کی کوئی بات نہ ہو۔ یہاں دین و دنیا کی اصلاً تقسیم نہیں ہے۔ یہ تقسیم لوگوں کی نیت اور کردار سے ہو جاتی ہے۔

سلہ عرب کے لوگ عرفات نہیں جاتے تھے، وہ مزدلفہ میں قیام کرتے تھے۔ عرفات حدودِ حرم سے باہر ہے۔ وہاں جانا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ ان کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ یہاں سب برابر ہیں، کسی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ جہاں (عرفات) سب لوگ آتے جاتے ہیں وہیں تم لوگ بھی آؤ جاؤ۔

ٹلہ یہ منیٰ میں تشریق کے دن قیام کا ذکر ہے۔ عرفہ میں قیام کے بعد واپسی میں لوگ جلدی کرتے تھے۔ اگر واقعی کوئی ضرورت ہو تو ۱۲ ذی الحجہ کو واپسی کی اجازت ہے، ورنہ ۱۳ تک وہاں قیام کرکے زیادہ سے زیادہ اللہ کی عبادت کرنی چاہیے۔

حج کے بعد دو مختلف کردار اور ان پر تبصرہ

حج جس والہانہ انداز سے کیا جاتا ہے اور اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کرنے کا جو نمونہ سامنے آتا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ حج کے بعد لوگوں کی زندگیوں میں بالکلیہ تبدیلی ہو اور زندگی کے ہر حال اور ہر معاملہ میں بس اللہ ہی کے فرمانبردار ہو کر رہیں۔ لیکن حج کے بعد ایسا نہیں ہوتا ہے۔ کچھ لوگ تو بیشک ایسے ہوتے ہیں کہ اپنی زندگی بدل کر اللہ کے پوری طرح فرمانبردار ہو جاتے ہیں، لیکن کچھ اپنی پرانی بگڑی ہوئی حالت پر قائم رہتے ہیں، بلکہ ان میں اور زیادہ جسارت پیدا ہو جاتی ہے۔ آگے کی آیتوں میں انہی دونوں کرداروں کا ذکر ہے اور اس پر تبصرہ بھی ہے۔ ان دونوں کرداروں کی ایک جھلک حج کے موقع پر بھی آگئی ہے، جبکہ دعا میں کچھ لوگوں نے صرف دنیا مانگی تھی اور کچھ لوگوں نے دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی مانگی تھی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا
تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ
بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ
يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا

خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ
بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾
هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ
وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

(البقرہ: ۲۰۴ تا ۲۱۰)

اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی باتیں دنیوی زندگی میں بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں اور وہ اپنے دل کی باتوں (ضمیر کی پاکی) پر اللہ کو گواہ (بھی) کرتے ہیں، حالانکہ وہ نہایت خراب لوگ ہیں، اور جب وہ اٹھ کر جاتے ہیں تو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور کھیتی و مویشی کو برباد کرتے ہیں، اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو وہ شیخی میں آکر اور (زیادہ) گناہ کرتے ہیں۔ ایسوں کے لیے تو بس دوزخ ہی کافی ہے، اور یقیناً وہ برا ٹھکانا ہے[1] اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بھی بیچ دیتے ہیں اور اللہ بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ اے ایمان والو اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، بیشک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے[2] پھر اگر تم واضح نشانیاں آنے کے بعد پھسل گئے تو جان لو کہ اللہ غالب ہے، حکمت والا ہے۔ وہ لوگ تو بس اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ ان کے سامنے بادلوں کے سایہ میں آموجود ہے اور فرشتے بھی ساتھ ہو، اور ان کا کام ہی تمام کر دیا جائے۔ اور سب کام اللہ ہی کے اختیار میں ہیں[3]۔

---

[1] یہ دنیا پرستی خدا پرستی کے مقابلہ میں ہے جس نے ہمیشہ وہی کردار پیش کیا ہے جو ان آیتوں میں ہے۔ دنیا پرستی کا غرور، گھمنڈ اپنے لیے دوسروں کو قربان کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور وہ سب کچھ کر گزرتا ہے۔ جو ظلم و فساد کرتا ہے اس کے پیش نظر صرف دنیا حاصل کرنا اور نفس کی خواہش پوری کرنا ہوتا ہے (جو کبھی پوری نہیں ہوتی ہے) خواہ اس کے لیے دوسروں کا جس قدر بھی خون کرنا پڑے یا انکو نقصان پہونچانا پڑے۔ یہی دنیا پرستی ہے جس کا اللہ کا دین مخالف ہے اور جس کے ساتھ اللہ کے دین

(باقی صـ۲۸)

تذکیر بالقرآن

از: مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی

یہ مقالہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام
'محاضرات قرآنی' (منعقدہ مارچ ۱۹۹۰ء) میں پیش کیا گیا۔

خداوند عالم جلّ وعلا نے ہادیٔ اسلام حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ہدایت فرمائی:

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۚ (قٓ:۴۵)

"(اے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم!) آپ قرآن کے ذریعہ ان لوگوں کو سمجھائیے جو میرے ڈرانے سے ڈرتے ہیں۔"

شاہ عبدالقادر صاحب امام المفسّرینؒ تذکیر کا ترجمہ 'سمجھانا' کرتے ہیں اور بڑے شاہ صاحب (شاہ ولی اللہؒ) نے 'پند و نصیحت' ترجمہ کیا ہے۔ سورۃ الذّاریات آیت (۵۵) کا ترجمہ فرماتے ہیں:

وَ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

"اور سمجھاتا رہ کہ سمجھانا کام آتا ہے ایمان والوں کو"

بڑے شاہ صاحب نے یہاں بھی تذکیر کا ترجمہ 'پند' (نصیحت) کیا ہے۔

سورۃ الحجر کی مشہور آیت:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ــــ میں شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اپنے والد محترم کا لفظ "نصیحت" اختیار فرمایا:

"ہم نے آپ اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم اس کے نگہبان ہیں"

لیکن بڑے شاہ صاحبؒ نے خود 'الذکر' کا ترجمہ 'قرآن' کیا ــــ کیونکہ آیت کریمہ میں جو اہم اعلان کیا گیا ہے اس کی مناسبت کا تقاضا تھا کہ 'الذکر' کا مصداق متعیّن اور واضح کر دیا جائے۔

حضرت امام المفسرین نے "سمجھاتا رہ" کا تاکیدی پیرایہ اختیار کرکے یہ اشارہ کیا کہ تذکیر بالقرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل مشن و منصب ہے۔

خداوند عالم نے سورۂ بنی اسرائیل (۴۱) میں اس امر کو بھی واضح کر دیا کہ قرآن کریم میں ہر قسم کی باتیں اور ہر نوع کے مضامین بار بار اسی لیے دوہرائے گئے ہیں کہ یہ نصیحت نامہ ہے۔

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّكَّرُوْا ؕ

تاکہ لوگ سوچیں، سمجھیں اور نصیحت حاصل کریں۔

اسی صورت کی آیت (۸۹) میں "مِنْ كُلِّ مَثَلٍ" کا اضافہ بھی کیا گیا ہے یعنی ہر داستان[1] نے اور ہر کہاوت اور ہر قسم کا عمدہ مضمون، تکرار کے ساتھ دوہرایا گیا ہے۔

اسی تذکیر بالقرآن کو ــــ الفرقان (۵۲) میں جہاد بالقرآن سے تعبیر کیا ہے:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِیْرًا ۝

"(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ ان کافروں کے کہنے میں نہ آئیں اور قرآن کے ذریعہ جہاد جاری رکھیں، پورے زور شور کے ساتھ"۔

تذکیر کس درجہ کی ہو؟ ــــ محض روایتی پند و موعظت اور رسمی وعظ و نصیحت کے درجہ کی نہیں بلکہ تمام ذرائع و وسائل کی قوت کے ساتھ، جان، مال، وقت، زبان، قلم، دل کی توجہ اور دماغ کی سمجھ، اخلاق و شرافت کی کشش اور بالآخر شمشیر و سناں کی قوت و طاقت کے ذریعہ ہو ــــ یہی جہاد کبیر ہے۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کے مختلف دور، جہاد کبیر کی مختلف منزلوں کے درمیان ایک حتمی اور ضروری ترتیب قائم کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے قرآن کریم میں نظم و ترتیب کی توجیہ کرتے ہوئے اصول تفسیر کی کتاب 'فوز الکبیر' میں لکھا ہے:

"قرآن مجید کو دوسری کتابوں کی طرح ابواب و فصول میں اس طرح مرتب نہیں کیا گیا کہ ہر مبحث ایک جداگانہ باب یا فصل میں بیان کیا جاتا بلکہ قرآن مجید کو "مجموعۂ مکتوبات" کی طرح سمجھنا چاہیے ــــ جس طرح بادشاہ اپنی رعایا کو حسب ضرورت وقت ایک فرمان لکھتے ہیں، یہاں تک کہ بہت سے فرمان جمع ہو جاتے ہیں اور پھر ان مکاتیب کو ایک مجموعہ کے طور پر مرتب کر دیا جاتا ہے" (۶۰)

---

[1] علی الترتیب شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور مولانا تھانویؒ

صاحبِ تفہیم القرآن نے حضرت شاہ صاحبؒ کی اسی توجیہ کو اختیار کیا ہے اور دیباچہ میں لکھا ہے:

"دعوتِ اسلامی کے سلسلہ میں حسب ضرورت ایک تقریر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی جاتی تھی اور آپ اسے ایک خطبہ کی شکل میں لوگوں کو سناتے تھے۔" (۸)

مصنف مرحوم نے اسی توجیہ کے مطابق قرآن کریم کے مختلف حصوں کے درمیان نظم و ترتیب قائم کی ہے اور بڑی خوبی سے قرآنی نظم کے اعجاز کو واضح کیا ہے۔

اور نظم و ترتیب کی اسی توجیہ سے قرآن کریم کی حیثیت تذکیر قائم رہتی نظر آتی ہے۔ ہر سورت کا ایک مرکزی عنوان و عمود قائم کر کے اس کے تحت آیاتِ قرآنی کے درمیان نظم قائم کرنے کی جو کوشش کی جاتی ہے وہ قرآن کریم کی چھوٹی سورتوں میں تو کامیاب نظر آتی ہے لیکن جہاں تک قرآن کریم کی بڑی سورتوں کا تعلق ہے ان میں یہ توجیہ و تاویل غیر ضروری تکلفات کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

تذکیر بالقرآن سے اہلِ عجم کی بے توجہی!

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اہلِ عجم نے تذکیر بالقرآن کی اہمیت کو بہت کم سمجھا۔ ہندوستان کی حد تک تو یہ حقیقت الم نشرح ہے۔ مشائخ چشتیہ کے دور کو اسلام کی اشاعت و تبلیغ کا کامیاب دور کہا جاتا ہے۔ ان بزرگوں میں صرف حضرت محبوب الٰہیؒ کے بارے میں یہ آتا ہے کہ شیخ کو قرآن کریم کی تلاوت و تعلیم سے بے حد دلچسپی تھی اور آپ کی خانقاہ حفظ خانہ معلوم ہوتی تھی۔ (مولانا گیلانی نظام تعلیم و تربیت ج ا ص۳۱۸)

قرآن کریم پر غور و فکر اور اس کے مطالب و علوم کی اشاعتِ عام کا کوئی ذکر اس پورے دور میں نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد عہدِ اکبری کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے خداوند عالم نے تین مجدد کھڑے کئے۔ ایک حضرت خواجہ عبد الباقیؒ اور دو اُن کے مرید، حضرت امام ربانیؒ اور شیخ محدث دہلویؒ۔

ان میں سے شیخ محدثؒ نے علوم اسلامی کے احیاء کا کام اپنے ذمہ لیا اور حدیث نبوی کی ترویج و اشاعت کے منصب پر بیٹھے۔ حضرت شیخ نے حدیث، فقہ، کلام اور تاریخ کے موضوع پر قلم اٹھایا اور ہر فن میں آٹھ نو کتابوں سے کم کتابیں تصنیف نہیں کیں۔ لیکن قرآن کریم کی تفسیر میں سورۃ النور اور سورۃ العادیات کی تفسیر اور بیضاوی کے حاشیہ سے زیادہ کام نہیں ہو سکا۔ (حیات شیخ خلیق نظامی ۲۴)۔

ایک صدی کے بعد حضرت امام شاہ ولی اللہؒ نے اس کمی کو شدت سے محسوس کیا اور قرآن کریم کی اشاعتِ عام کی تحریک شروع کی ـــ اور اس تحریک کو آپ کے تینوں صاحبزادگان نے پروان چڑھایا۔ مشہور نقشبندی بزرگ حضرت مرزا جانِ جاناںؒ کے خلیفۂ ارشد حضرت شاہ غلام علی صاحب مجددیؒ کے بیان پر تعجب ہوتا ہے کہ :

" حضرت مرزا صاحبؒ نے اپنے مرید شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کو لکھا کہ اپنا سارا وقت ذکرِ الٰہی اور مراقبہ میں گزارو اور کوئی دوسرا شغل اختیار نہ کرو۔ اسی وجہ سے شاہ مراد اللہ نے سورۂ بقرہ کی ابتدائی (۲۰) آیتوں کی تفسیر کے بعد تفسیر کا سلسلہ بند کر دیا۔ (مقاماتِ مظہری ص۱۷)

شاہ مراد اللہؒ ولی اللٰہی تحریک سے متاثر تھے اور آپ نے پارۂ عم کی مکمل تفسیر لکھی جو اُس وقت کی فصیح اردو میں قرآن کریم کی پہلی تفسیر ہے ـــ اور اس غیر مکمل اردو تفسیر کو شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے اردو تراجم پر تقدم حاصل ہے۔ شاہ مراد اللہ انصاریؒ کی وفات ۱۲۰۵ھ میں ہوئی اور شاہ صاحب نے ۱۲۳۰ھ میں وصال فرمایا۔ شاہ مراد اللہؒ کے موحدانہ تصورات کی وجہ سے ان کی تفسیر کو مجاہدین بالاکوٹ کا حلقہ شائع کرتا رہا، یہاں تک کہ انگریزوں نے جب وہابی لٹریچر پہ پابندی لگائی تو اس تفسیر کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔ (ہندوستان میں وہابی تحریک ص۳۰۵)

ولی اللٰہی تحریک کے داعی

شاہ ولی اللہ کی تحریک تذکیر بالقرآن، شاہ صاحبؒ کی جماعت کے بلند پایہ ارکان نے پوری قوت سے قائم رکھی۔ آج اردو میں قرآن پاک کے جتنے تراجم اور تفاسیر موجود ہیں وہ سب جماعت ولی اللٰہی کی قلمی کاوشوں کا نتیجہ ہیں اور اسی طرح عام مسلمانوں میں قرآن کریم کے ساتھ جو دلچسپی نظر آتی ہے یہ بھی اسی جماعت کی تقریری اور درسی سرگرمیوں کا ثمرہ ہے۔ راقم السطور نے محاسنِ موضح القرآن میں ان داعیانِ قرآن کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔

اس اجلاس میں جس ہستی کی قرآنی جدوجہد کا تعارف کرایا جا رہا ہے وہ قابلِ قدر ہستی جماعت ولی اللہؒ کے قرآنی ورثہ کی آخری امین معلوم ہوتی ہے ـــ واللہ اعلم وعلمہٗ اتم ـــ یہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ ہیں ـــ جنہوں نے " دعوت رجوع الی القرآن " کے عنوان سے اپنے اسلاف

کے نقشِ قدم کے مطابق قرآن کریم کے ظاہر و باطن، الفاظ و معانی اور تلاوت و تفکر کی ایک سرگرم لہر پیدا کر دی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی کامیابی کا راز

ڈاکٹر صاحب کی دہلی کے اندر مختلف تقریریں سننے کے بعد ایک معصوم سیرت پرانے بزرگ نے مجھ سے کہا کہ کیا مولانا لوگ اب اپنے آپ کو ڈاکٹر صاحب کہلوانے لگے ہیں — مولانا مولوی کے الفاظ انہیں برے معلوم ہونے لگے؟ میں نے ہنس کر جواب دیا کہ نہیں وہ مولانا صاحب ہی ہیں، پیار سے لوگ انہیں ڈاکٹر صاحب کہہ دیتے ہیں — اور میں ان سے کیا کہتا؟ تحریکی مزاج ادعائی ہوتا ہے۔ تحریک کے قائد میں اگر "انا ولا غیری" کا جذبہ نہ ہو تو وہ لوگوں کو اپنی طرف کیسے کھینچ سکتا ہے؟ — لیکن قرآن کریم کے ساتھ سچی لگن اور تحریکات کی تاریخ پر گہری نظر نے ڈاکٹر صاحب کے اندر جو ذہن پیدا کیا ہے میں اسے ادعائی ذہن کے مقابلہ میں اتفاقی ذہن سے تعبیر کر سکتا ہوں۔ اسی ذہن و فکر نے ڈاکٹر صاحب کو جدید و قدیم کی تفریق کے بغیر ملتِ اسلامیہ کے تمام ممتاز اہلِ علم اور اصحابِ عرفان بزرگوں کی عقیدت سے جوڑ دیا — اور ڈاکٹر صاحب نے اس نزاکت کی پرواہ نہیں کی کہ مسٹر اور مولوی کی چپقلش کے اس دور میں علمائے جدید مجھ سے اس لیے بگڑ جائیں گے کہ میں نے قدیم مولویوں کی طرف رخ کیوں کیا اور علمائے قدیم میری نیت پر اس لیے بھروسہ نہیں کریں گے کہ میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر بھی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خارزار کو بڑی استقامت اور محبت سے طے کر لیا۔ خود لکھتے ہیں۔

"———— اور اس 'سیر الی القرآن' کے ضمن میں راقم جہاں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور اُن کی 'تفہیم القرآن' اور مولانا ابوالکلام آزاد اور اُن کے 'ترجمان القرآن' سے متعارف ہوا، اور اسی طرح مولانا امین احسن اصلاحی اور اُن کے استاذ اور امام حمید الدین فراہیؒ کے طریقِ 'تدبر قرآن' سے روشناس ہوا، وہاں الحمد للہ کہ ۱۹۵۲ء کے لگ بھگ اس کا ذہنی و قلبی رشتہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی کے ذریعے سلفِ صالحین اور راسخون فی العلم کے "عُروۃ وُثقیٰ" سے بھی قائم ہو گیا ——— اور اس کے بعد تین چار سال کے اندر اندر ہی راقم کے فہم و فکرِ قرآن کے ان 'ابعادِ ثلاثہ' پر ایک 'بُعدِ رابع' (FOURTH DIMENSION) کا اضافہ علامہ اقبال کے فلسفیانہ، اور صحیح تر الفاظ میں متکلمانہ اور متصوفانہ افکار کا ہو گیا۔"

ڈاکٹر صاحب نے سلف صالحین اور راسخین فی العلم کے الفاظ سے جن بزرگوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں حضرت امام المفسرین شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ہو سکتے ہیں ــــ کیونکہ حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ معمولی تسہیل کے ساتھ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ ہی کا ترجمہ (موضح قرآن) ہے۔ اور مولانا عثمانیؒ کے تفسیری حواشی میں بھی بڑا حصہ شاہ صاحب کے تفسیری فوائد کا ہے۔ مولانا عثمانیؒ نے شاہ صاحب کی پرانی زبان کو آسان کر کے کسی جگہ شاہ صاحبؒ کے نام سے اور کسی جگہ بغیر حوالہ کے وہ فوائد نقل فرمائے ہیں ــــ اور حضرت تھانویؒ کی بیان القرآن بھی مولانا کے حواشی میں جگہ جگہ نظر آتی ہے، صرف حضرت تھانویؒ کی قصباتی زبان کو شستہ کر دیا گیا ہے۔ اور بلاشبہ کہیں کہیں مولانا عثمانیؒ کا علمی تبحر بھی منہ سے بولتا نظر آتا ہے۔

بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کے اندر قرآن کریم کے اصولی پیغام (غلبۂ دین) کی اشاعت عام اور اس کے لیے ایک مؤثر تنظیم قائم کرنے کا مخلصانہ جذبہ کارفرما ہے۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر صاحب بلا لومۃ اور کسی کی خفگی اور کسی کی خوشنودی سے بلند ہو کر اپنے اس تصور کا اعلان کرتے ہیں :-

"حضرت شیخ الہندؒ کا انتقال راقم کی پیدائش سے لگ بھگ بارہ سال قبل ہو چکا تھا اور ان کے ساتھ راقم کا ذہنی و قلبی رشتہ کل کا کل 'غایبانہ' ہے۔ بایں ہمہ ان کی عظمت کے جو نقوش اس عاجز کے قلب پر کندہ ہیں ان کو الفاظ کا جامہ پہنانا نہایت مشکل نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ راقم کو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جامعیت کبریٰ کا عکس کامل اُن کی شخصیت میں نظر آتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ امام الہند کی جامعیت کا مظہر ان کی تصانیف ہیں اور شیخ الہندؒ کی جامعیت کا ظہور ان کے تلامذہ میں ہوا۔ اگر یہ اُصول درست ہے اور لازماً درست ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو ذرا پہچاننے کی کوشش کیجیے اس شخص کی عظمت کو جس کا جانشین جہادِ حریت اور تحریک استخلاص وطن کے میدان میں ہوا مولانا حسین احمد مدنیؒ ایسا مجاہد اعظم۔ اور حدیث، فقہ، اُصول اور کلام کے میدان میں ہوا مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ ایسا نابغۂ روزگار انسان۔ اور جس کے فہم قرآن اور جذبۂ ملی کا ظہور ہوا مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسی عظیم شخصیت میں اور جس کے انقلابی کردار نے رُوپ دھارا مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم ایسے سیماب وش انسان کا ــــ راقم کا ذاتی احساس یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کو ان کے اپنے حلقے کے لوگوں نے بھی کما حقہٗ نہیں پہچانا ــــ ورنہ ذرا غور کیا جائے تو اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ چودھویں صدی ہجری کے مجدد وہ ہیں! ــــ واللہ اعلم!

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا انتقال تو اگرچہ راقم کے سن شعور کو پہنچنے کے بعد ہوا لیکن افسوس

کہ ان کی زیارت سے بھی محرومی ہی رہی۔ تاہم ایک خیال اطمینانِ قلب کا موجب بنتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ذرّے کو آفتاب سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو اس عاجز کو بھی ان کے ساتھ ایک نسبتِ معنوی حاصل ہے۔"

اس تبصرہ میں ڈاکٹر صاحب کے قلم سے شیخ الہندؒ کے مشہور شاگرد حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ کا اسم گرامی رہ گیا۔ حضرت مفتی صاحب کو شیخ الہند کے تلامذہ کے حلقہ میں تفقہ و تفکر کا امتیاز حاصل تھا۔

مفتی صاحب جمعیۃ علماء ہند کے بانیوں میں شامل تھے اور تقریباً تیس سال تک جمعیۃ علماء ہند کی صدارت کے منصب پر فائز رہے۔ اور علماء ہند کی اس نمائندہ تنظیم میں خیرآبادی اور فرنگی محلی اور دیوبندی مکتبِ خیال کے نمایاں اکابر بشمول مولانا شبیر احمد عثمانی شریک تھے۔

فکری اعتدال

رجوع الی القرآن کی یہ تحریک عالم اسلام کی احیائی تحریکوں کے نتائج کو اچھی طرح سمجھ کر شروع کی گئی ہے۔ اس لیے اس میں فکری اور عملی اعتدال نظر آتا ہے اور ابتداء میں غلبۂ دین کی معروف تعبیرات کا جو زور تھا وہ بہت جلد اعتدال یعنی تجدید ایمان کی دعوت کی طرف آگیا ہے۔

رجوع الی القرآن کی تحریک کے ساتھ جڑنے والے مخلص مسلمانوں کو اس حقیقت پر گہری نظر رکھنی چاہیئے کہ اس تحریک کے امیرِ محترم کو اس امر کا اعتراف ہے کہ:۔

> احیاء اسلامی کی تمام تحریکوں کی ناکامی کا سبب بظاہر تو یہ ہے کہ انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور اپنے اپنے ملکوں میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی معتدبہ تعداد کے ذہنوں کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا ——— لیکن درحقیقت ان کی ناکامی براہِ راست نتیجہ ہے ان کے تصورِ دین کی خامی اور مطالعۂ اسلام کے نقص کا۔
>
> دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اس مغربی نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادہ کو اور حیاتِ اخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیت حاصل ہے ———
>
> اسی فکر سے متاثر دورِ جدید کے ایک داعیٔ اسلام کا یہ فقرہ ایک ثقہ راوی نے روایت کیا کہ اسلام دراصل ایک سیاسی اور عمرانی نظام ہے جس پر الٰہیات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔
>
> (دعوت رجوع الی القرآن صفحہ ۴۵ و ۴۶ کی ترجمانی)

عیسائیت کا گمراہ کن پروپیگنڈا

ڈاکٹر صاحب قبلہ نے اسلامی تحریکوں کی ناکامی کا بنیادی سبب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان قائدین نے مغربی نقطۂ نظر سے اسلام کا مطالعہ کیا ـــــ لیکن ڈاکٹر صاحب جیسے وسیع المطالعہ عالم اس کے حقیقی پس منظر سے بھی آگاہ ہوں گے اور ان کے علم و مطالعہ میں ضرور یہ بات آئی ہوگی کہ ایک طرف مغربی قومیں مادہ کو اصل قرار دے کر دنیوی میدان میں خود تو ترقی کر رہی تھیں مگر دوسری طرف ان کا مذہبی شعبہ (عیسائیت) اس پروپیگنڈہ میں مصروف تھا کہ سب کچھ آخرت ہے، دنیا لعنت کے قابل ہے اور اسے وہ عین اسلام قرار دے رہے تھے۔ تاکہ مسلمان معاشی اور سماجی مسائل سے دور رہیں اور مغربی طاقتیں پورے اطمینان سے ان پر حکمرانی کرتی رہیں۔

اس سلسلہ میں 'الجمعیۃ' اخبار کے مشہور ایڈیٹر مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط نے جو عیسائیت کے مقابلہ میں اسلام کے بہت بڑے مناظر رہ چکے تھے اور مسلک کے لحاظ سے مولانا آزاد کی طرح ولی اللّٰہی حنفی تھے اپنے ایک اداریہ میں مصنفِ 'جوامع الکلم' علامہ سید رشید رضا کے حوالہ سے لکھا تھا:

"جنیوا میں امیر شکیب ارسلان کی یاد بار بار آتی ہے، ایک روز وہ اپنی کتابیں اُلٹ پلٹ کر رہے تھے، ـــــ کہ ایک کتاب میری طرف سرکائی اور بولے اسے دیکھو۔ میں نے ایک گھنٹہ تک اس کا مطالعہ کیا، ساری کتاب قرآن کریم اور احادیث کے حوالوں سے بھری ہوئی تھی، اس کا موضوع تھا ـــــ "دنیا کی مذمت اور آخرت کی فضیلت"۔ امیر ارسلان نے فرمایا: بتاؤ! کتاب کے مصنف نے کیا غلطی کی؟ دنیا کو برطرف کر کے مسلمانوں کو اپاہج بنانا ـــــ پھر وہ مسکرائے اور فرمایا: برطانیہ کی کیتھولک سوسائٹی کی طرف سے یہ کتاب شائع کی گئی ہے اور ایک پادری جسے میں خوب جانتا ہوں اس کا مصنف ہے۔"

سید رشید رضا لکھتے ہیں:

"قاہرہ کے قریب ایک بستی میں ایک عیسائی بڑی خوش الحانی کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتا تھا اور مسلمانوں سے کہتا تھا کہ مجھے اسلام کی تعلیم یوں پسند ہے کہ وہ دنیا پر توجہ نہیں دیتا وہ صرف ذکر و فکر، مراقبہ اور تسبیح و تہلیل پر سارا زور خرچ کرتا ہے۔ وہ پادری جب اپنا کچر ختم کر چکا تو میں نے اس گمراہ کن پروپیگنڈہ کا پردہ چاک کیا اور

مسلمانوں کو بتایا کہ اسلام دنیا اور آخرت کے بارے میں کیا تعلیم دیتا ہے؟
(المنار ۳۰ جنوری ۱۹۲۹ء)

مسلم حکمرانوں کی خواہش

ہندوستان کے وحیدالدین خاں صاحب کی تحریک جسے وہ تحریک الرسالہ کہتے ہیں۔ ('الرسالہ' اُن کے ماہنامے کا نام ہے) ـــــ عیسائیت کے اسی گمراہ کن پروپیگنڈہ کا عکس اور اسی کی نقل ہے۔ خانصاحب کا یہ مشن ہے کہ دنیائے اسلام میں جس قدر احیاء اسلام اور قیام دین کی تحریکیں جاری ہوئیں وہ سب اسلام کے نام پر غیر اسلام کی تبلیغ و دعوت تھی، ان تحریکوں سے اسلام اور مسلمانوں کو وقت، جان اور مال کے ضیاع کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔

اسلام کے یہ جدید نام نہاد فلسفی ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ مسلمان قومی زندگی کی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھنا پسند کریں۔ اور اسلام پر فخر کرنے کی باتیں بند کردیں ـــــ ان کے سارے مسائل کا حل یہی ہے۔ دنیائے اسلام کی دینی تحریکوں کی ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے وحیدالدین خاں اور دوسرے حضرات اسلامی تحریکوں کے اس کامیاب پہلو کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ ان دینی تحریکوں نے عیسائیت کے اس پروپیگنڈہ کا توڑ کیا۔ اور یہ ثابت کیا کہ اسلام دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کا کفیل ہے۔ اس طرح مغرب اور مشرق کی ملحدانہ اور اشتراکی تحریکوں کے اثرات سے مسلمانوں کو بچایا ـــــ یہ تحریکیں یہ پروپیگنڈہ کر رہی تھیں کہ دنیا کی معاشی اور سماجی فلاح کا انتظام اسلام کے پاس نہیں ہے ـــــ مذہب بیزار اور مخالف اسلام تحریکوں کے پاس ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سیاست ہو یا مذہب، ہر میدان میں افراط و تفریط نے مسلمان قوم کی ہڈی پسلیاں توڑ کر رکھ دی ہیں۔ اگر ان اسلامی تحریکات میں کچھ غلو پیدا ہوا تو اس کے جواب میں بھی یہ انتہائی غلو پسندی ہے جو وحیدالدین خاں صاحب کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔

آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ روس کی ملحدانہ اشتراکیت ستر سال کے بعد دم توڑتی نظر آرہی ہے اور اشتراکی جبر و تشدد میں پسنے والی مسلم قوموں کے اندر کمیونزم کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی اسلامی جذبہ ابھر رہا ہے۔ یہ دنیا کی اسلامی تحریکات کا دفاعی کارنامہ ہے ـــــ ان تحریکات میں اہل حق نے جو قربانیاں دیں وہ رائیگاں نہیں گئیں، وہ اسلامی لٹریچر جو دین برحق کو ایک کامیاب دنیوی اور دینی نظام حیات ثابت کرتا ہے، وہ بے اثر نہیں ـــــ اس کا بھی ایک اہم مقام ہے۔

مسلمانوں پر مغرب کے سیاسی غلبہ کے دور میں جس طرح عیسائی حکمراں یہ چاہتے تھے کہ مسلمان سیاست اور حکومت کے معاملات سے بالکل الگ رہیں اور اسے دنیا سمجھ کر اس سے نفرت کرنے لگیں ـــ اسی طرح آج کے مسلم حکمرانوں کا بھی یہی منشا ہے کہ مسلم عوام حکومتی معاملات سے الگ تھلگ رہیں۔ چنانچہ وحیدالدین خان صاحب پر اس پروپیگنڈہ کی قیمت بے تحاشا دولت کی صورت میں برس رہی ہے۔ اور آپ کو حیرت ہوگی کہ لیبیا کے قذافی صاحب کے ساتھ سعودی عربیہ سے بھی خان صاحب کو بھاری امداد حاصل ہوتی ہے۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کی ترغیب دینے والے مفکر گلی قاسم جان دہلی کے ایک معمولی کمرہ سے نکل کر نظام الدین دہلی کی ایک عالیشان کوٹھی میں سب سے اگلی سیٹ پر براجمان نظر آتے ہیں۔

کیا پاکستان جیسے مسلم ملک میں کسی مذہبی ماہنامہ کی اشاعت بیس پچیس ہزار ہے؟ لیکن ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں خانصاحب کا 'الرسالہ' اتنی ہی تعداد میں چھپتا ہے اور ہر سرکاری دانش ور اس کا خریدار ہے۔ اور مسلمانوں کے فرضی ناموں سے رات دن خانصاحب کے فلسفہ کو حقیقی اسلام قرار دے کر مراسلے شائع کیے جاتے ہیں اور اسلام کی نمائندگی کرنے کے لیے خانصاحب ہی کو زحمت دی جاتی ہے۔

پاکستان کے سابق حکمراں ضیاء الحق صاحب مرحوم نے خانصاحب کی ایک کتاب پر انہیں گراں قدر عطیہ وانعام عطا فرمایا تھا۔ اس کے بارے میں ہندوستان کے ایک ماہنامہ نے لکھا تھا کہ ایک بین الاقوامی ادارہ کی پرزور سفارش پر خانصاحب کو اس انعام سے نوازا گیا ہے

دعوت رجوع الی القرآن کی کرامت

میں اسے تذکیر بالقرآن کی جدوجہد کا اعجاز سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کو خداوندِ عالم نے کتاب زندہ قرآن حکیم کی خدمت کے لیے بھرپور وسائل عطا فرمائے۔ ڈاکٹر صاحب کو حضرتِ حق نے تقریر اور تحریر دونوں قوتوں سے نوازا، اخلاقی اور مالی تعاون کرنے والے رفقاء عطا کیے، ڈاکٹر صاحب کے اندر تنظیمی صلاحیت اور حسنِ اخلاق کی روشنی ودیعت فرمائی، اور کارِ دعوت میں تعاون کرنے والے اہلِ بیت کو نصرت فرمائی ـــ اس اہم تعمیری خدمت کے لیے چالیس سال کی مدت کچھ نہیں ہوتی، مگر اس قلیل مدت میں خدا تعالیٰ نے جو ٹھوس کام ڈاکٹر صاحب سے لے لیے وہ ان کے مشن کے حق میں حسنِ قبول کی علامت ہے۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام جو اجتماعات پابندی سے منعقد ہوتے ہیں اور دوسرے تربیتی اجتماعات میں رفقاء کی دلچسپی کا جو نقشہ میں نے دیکھا ہے وہ اس جدّوجہد

کی کامیابی کا پتہ دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تالیفات اور تقریروں کے کیسٹ خواص و عوام دونوں طبقوں میں مقبول نظر آتے ہیں۔

پچھلے مردم خیز دور میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اپنے اپنے رنگ میں بلاشبہ سحبان الہند تھے۔ لیکن دہلی کے مشہور سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب کی خطابت کا رنگ بالکل الگ تھا۔ مولانا مرحوم کو خدا تعالیٰ نے قرآنِ حکیم کا بہترین حافظہ اور اس پر بے مثال عبور عطا کیا تھا۔ مولانا کے مواعظ تذکیر بالقرآن کی صحیح تصویر ہوتے تھے۔ مرحوم کئی کئی گھنٹے آیاتِ قرآنی کی تلاوت کے ساتھ سیرتِ انبیاء اور سیرتِ نبویؐ پر عوام کو ہنساتے اور رلاتے تقریر کرتے تھے۔ البتہ بات میں سے بات نکل کر تقریر پھیل جاتی تھی اور مولانا خداداد حافظے سے کام لے کر تقریر کو اصل موضوع سے جوڑ دیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی خطابت کا خاص رنگ یہ ہے کہ موصوف کئی کئی گھنٹے نہایت قادر الکلامی کے ساتھ فصیح و بلیغ دہلوی اُردو میں موضوع اور عنوان کی پابندی کے ساتھ تقریر کرتے ہیں۔ اور سامعین عوام ہوں یا خواص، وہ بور نہیں ہوتے۔ اور موصوف کو بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ سامعین کی دلچسپی کے لیے بات میں سے بات پیدا کر کے تقریر کو پھیلایا جائے۔

ڈاکٹر صاحب وطنی اعتبار سے ہریانے کے اگروال ہیں اور ترکِ وطن کے بعد پنجاب میں موصوف کی زندگی کا بڑا حصّہ گزرا ہے ـــــ لیکن موصوف کا تلفظ اور لب و لہجہ کسی وقت بھی اس کی چغلی نہیں کھاتا ـــــ بلکہ وہ دہلویت کے رنگ پر قادر نظر آتے ہیں۔ ہمارے دوست مولانا سعید الرحمان صاحب علوی اپنی تحریروں میں خالص دہلوی نظر آتے ہیں لیکن کبھی کبھی خطابت کے زور میں ان کی زبان پر ان کے مادری الفاظ ـــ اسیٔ تسیٔ، آ ہی جاتے ہیں۔ اور وہ بڑے خوبصورت لگتے ہیں۔ مولانا احمد سعید صاحب گرونانک کا یہ پنجابی شعر پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ الہامی شعر ہے۔ اسے اتنی لطافت کے ساتھ اردو میں منتقل کرنا ممکن نہیں۔ وہ شعر یہ ہے ؎

پہلا نام خدا دا، دُوجا نام رسول ــــ پڑھلے کلمہ نانکا! درگاہ نویں قبول

ڈاکٹر صاحب کی شخصیّت، اسلام کی کرامت

ڈاکٹر صاحب کے دورۂ دہلی و حیدر آباد کے بعد ہندوستان میں پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے۔ دہلی کی دیواروں پر ڈاکٹر اسرار احمد

صاحب کے جگہ جگہ پوسٹر چسپاں تھے۔ اور دلّی کے ہندو مسلم عوام کے ذہنوں میں یہ نام موجود تھا۔ اس موقعہ پر ایک انتخابی میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے خاکسار نے ایک لطیفہ کی بات یہ کہی کہ ہندوستان کے فرقہ پرست مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ جس قومی دھارے سے نکل کر گئے تھے، اس میں واپس آجائیں، ـــ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس وقت پاکستان کا بہت بڑا اسلامی اسکالر اور کٹر مسلمان حصار ہریانے کا ایک اگروال، ایم، بی، بی، ایس ڈاکٹر ہے، اور ابھی چند روز پہلے وہ صاحب دہلی میں تھے جن کا نام ابھی تک دلّی کی دیواروں پر چسپاں ہے اور وہ ہیں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ـــ عام مسلمانوں کو دعوت دینے کے بجائے اس ایک "اگروال مولوی" سے اس کے نئے مذہب اسلام کے بارے میں بات چیت کرو اور اگروال برادری کے پورکھ مہاراجہ اگرسین کا واسطہ دے کر اسے سمجھاؤ ـــ پھر دیکھو کہ وہ اپنے قومی دھارے میں واپس آتے ہیں یا تم بھی ان کا قرآنی بھاشن سُن کر ان کے قومی دھارے میں شامل ہو جاتے ہو۔

ڈاکٹر صاحب اگر ہندوستان میں ہوتے تو ان کی اگروال راجپوت نسبت سے بڑا فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا ـــ مگر اسلام ان شخصی نسبتوں کو پسند نہیں کرتا۔ وہ نسبتیں عرب کی ہوں یا عجم کی ـــ اسلام تو حضرت سلمان فارسیؓ کی اس نسبت کو پسند کرتا ہے، کہ سلمان ابنِ اسلام ـــ پھر اس محبتِ اسلام کے جواب میں ہادیٔ اسلامؐ بھی یہ فرماتے ہیں ـــ سلمان اہل بیتی، ـــ

لوگوں میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت پسماندہ ہندو ذاتوں سے تعلق رکھتی ہے ـــ حالانکہ اسلام کی یہ کرامت ہے کہ عہدِ اوّل میں اگر غلام طبقہ نے اسلام قبول کیا تو انہی کے ساتھ قریش کی بڑی بڑی معزز شاخوں کے سردار بھی اسلام کی آغوش میں آئے۔

اسی طرح ہندوستان کے مظلوم عوام کے ساتھ ہندوستان کی بڑی بڑی برادریوں اور راجہ مہاراجہ کی اولاد نے بھی قبولِ اسلام کا شرف حاصل کیا۔ علامہ اقبال نے اپنی برہمنی نسبت پر فخر کرتے ہوئے کہا ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمے بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

قرآن کالج کا قیام

مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن کریم کی دعوت و تذکیر کے لیے "دارالارشاد" قائم کیا اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے "نظارۃ المعارف" کی داغ بیل ڈالی۔ مگر یہ دونوں ادارے ان حضرات کی سیاسی سرگرمیوں کی نذر ہوگئے۔ جماعتِ ولی اللہی کے صاحبِ علم و عرفان بزرگ مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ نے (جو نظارۃ المعارف کے ناظم رہ چکے تھے) لاہور میں انجمن خدام الدین کی بنیاد ڈالی اور اس کے تحت فارغ التحصیل عربی طلباء کے لیے دورۂ تفسیر کا ایک مختصر پروگرام شیرانوالہ گیٹ کی مسجد میں شروع کیا۔ یہ پروگرام مولانا کے خاص طرزِ تفسیر اور روحانی اخلاص کی بدولت نہایت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ اور مولانا ابوالحسن علی ندوی جیسے اہلِ علم نے اس سے استفادہ کیا۔ یہ خاکسار بھی اس سعادت سے بہرہ مند ہوا۔

مولانا لاہوری قرآن کریم کی چھوٹی سورتوں کو عنوان دے کر ان کے مطالب کا خلاصہ طلباء کو یاد کرایا کرتے تھے اور دوسرے دن پہلے دن کا سبق سنا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ میرے پاس سے قرآن کریم پر بولنے کی قدرت و جرأت لے کر جاؤ اور تمہاری ہچکچاہٹ دور ہو جائے —— اور واقعی مولانا کے سہ ماہی نصاب کے بعد طلباء جو علماء ہوتے تھے، قرآن کریم پر بولنے کی جرأت اور شوق و ذوق لے کر اپنے گھروں کو واپس جاتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ مسجد شیرانوالہ میں صبح کا درس بھی دیتے تھے اور جمعہ کو خطاب بھی فرماتے تھے اور میں نے دیکھا کہ بڑے طرہ باز پنجابی مولانا کی تقریروں میں سر جھکائے ہوئے ان کی ڈانٹیاں سنتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا قرآن کالج انہی بزرگانِ دین کے خوابوں کی تعبیر ہے —— یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ جس سرزمین پر ایک ولی اللہی درویش عالم نے پچاس برس کے قریب قوم کو قرآنی پیغام سے آشنا کیا، راتوں کو رو رو کر خدا تعالےٰ سے قبولیت کی دعائیں کیں۔ وہ سرزمین قرآن کریم کی صداؤں سے محروم رہتی۔ خدا تعالےٰ نے ڈاکٹر صاحب کے ذریعہ اس خلاء کو پر کیا۔ اور قرآن کالج قوم کے سامنے آیا۔ قرآن کالج میں تعلیم یافتہ مسلم نونہالوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا ہے اور مجھے امید ہے کہ ایک کلاس طلبہ عربی کے لیے بھی اسی نہج پر قائم ہوگی۔ جو مولانا لاہوری نے قائم کیا تھا۔ خدا کرے کہ ہمارا حلقہ اس حقیقت کو سمجھ لے کہ اَللّٰہُ یَعْلَمُ حَیْثُ

يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ـــ اور وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ـــ اور رجوع الی القرآن کی دعوت میں حصّہ لے۔

ایمان ویقین کی تحریک

ڈاکٹر صاحب نے تعلیم یافتہ طبقہ کو تجدید ایمان کی دعوت دیتے ہوئے دنیائے اسلام میں کام کرنے والی ایمان ویقین کی اس تحریک کی طرف متوجہ کیا ہے جسے تبلیغی جماعت کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں :

"اور اگرچہ جب سے مغرب کی الحاد و مادہ پرستی کے زہر سے مسموم ہواؤں کا زور ہوا ایمان ویقین کے یہ بازار بھی بہت حد تک سرد پڑ گئے تاہم ابھی ایسی شخصیتیں بالکل ناپید نہیں ہوئیں جن کے "دلِ روشن" "نورِ یقین" اور "نفسِ گرم" حرارتِ ایمانی سے معمور ہیں۔ اور اب ضرورت اس کی ہے کہ ایمان ویقین کی ایک عام رَو ایسی چلے کہ قریہ قریہ اور بستی بستی ایسے صاحب عزیمت لوگ موجود ہوں جن کی زندگیوں کا مقصد وحید خدا کی رضاجوئی اور اس کی خوشنودی کا حصول ہو اور جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک کے مطابق کہ لَاَنْ يَّهْدِيَ بِكَ اللّٰهُ رَجُلًا وَّاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ خلق کی ہدایت و رہنمائی کو زندگی کا واحد لائحہ عمل قرار دے لیں۔ اور اس کے سوا ان کی زندگی میں کوئی اور تمنا، آرزو یا حوصلہ و اُمنگ باقی نہ رہے۔

خوش قسمتی سے برصغیر ہند و پاک میں ایک وسیع پیمانے پر ایسی حرکت پیدا بھی ہو چکی ہے جس کے زیر اثر عوام میں ایمان کی روشنی پھیل رہی ہے اور کائنات سے زیادہ خالق کائنات مادے سے زیادہ رُوح اور حیاتِ دنیوی سے زیادہ حیاتِ اُخروی کی اہمیت کا احساس اجاگر ہو رہا ہے۔ ہماری مراد جماعتِ تبلیغی سے ہے جسے بجا طور پر تحریکِ دیوبند کی ایک شاخ قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کی تاسیس کچھ ایسے اصحاب ایمان ویقین کے ہاتھوں ہوئی ہے کہ آج ایک تہائی صدی سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود اس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی، اور اس کے باوجود کہ اس کے طریق کار سے ہم کلیتہً اتفاق نہیں کرتے ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس کے زیر اثر لوگوں کے طرز فکر اور نقطۂ نظر میں ایک ایسی عمومی تبدیلی واقعتہً پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اصل حیثیت کائنات کی نہیں خالق کائنات کی ہے اور اصل اہمیت اسباب کی نہیں مسبب الاسباب کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو اس تحریک سے جو اختلاف ہے وہ صرف اتنا ہے کہ یہ تحریک عقل اور علم کے بجائے جذبات کو مخاطب کرتی ہے، اس لیے وہ طبقہ جس کے ہاں جذبات پر عقل اور عمل پر علم کو اولیت حاصل ہے، اس تحریک سے متاثر نہیں ہوتا — اور اس وجہ سے ضروری ہے کہ ایمان و یقین کی ایک زبردست علمی تحریک اٹھے جو ملت کے اعلیٰ ترین طبقات اور مسلم معاشرے کے ذہین و فہیم حصّہ میں فکر و نظر کا انقلاب عظیم برپا کر دے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس تحریک میں ایک خامی یہ بھی ہے کہ اس میں قرآن کریم کا وہ نکتۂ اعتدال باقی نہیں رہا، جس میں اگر نماز کو اہم عبادت کہا گیا ہے تو رزقِ حلال کی جدّوجہد (تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت) کو تلاشِ فضلِ خداوندی قرار دے کر اس کی اہمیت پر بھی توجہ دلائی گئی۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ (الجمعۃ)

نہی عن المنکر کی تحریک!

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قرآنی اصطلاحوں کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو رجوع الی القرآن کی دعوت دین کے دونوں جزؤں پر مشتمل نظر آتی ہے۔ امر بالمعروف کا جزء قولاً بھی اور عملاً بھی اپنے جامع مفہوم کے اعتبار سے موجود ہے — اور الحمدللہ اس تنظیم کے ارکان میں نماز، روزہ اور تلاوت اور ذکر و نوافل کے خاص مہینہ رمضان میں فرض عبادات کے ساتھ مستحبات کا اہتمام خداوندِ عالم کی اس تنظیم پر بڑی کرم فرمائی ہے۔ البتہ نہی عن المنکر کی عملی تحریک کی ایک کمی نظر آتی تھی جسے اب پورا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور اس کا آغاز سرکاری ذرائع ابلاغ کی فہمائش سے کیا گیا ہے، کیونکہ ایک مسلم مملکت (اسلامی مملکت نہ سہی) کے لیے یہ بات انتہائی شرمناک ہے کہ اس کے ذرائع ابلاغ فحشاء اور منکرات کی اشاعت اور ترغیب کا فرض انجام دیں۔

بے حیائی اور بے شرمی کی اشاعت قرآن کریم کی نظر میں ایسا بدترین جرم ہے کہ خداوندِ عالم نے اس کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں عذابِ الیم کی وعید سنائی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ

اٰمَنُوۡا لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۙ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ‌ؕ
وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ○ (النّور: ۱۹)

قرآن کریم میں تقریباً ڈھائی سو آیتوں میں مختلف جرائم کی سزا کے سلسلہ میں عذاب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے — لیکن مسلمانوں کے اندر حیاسوز [illegible] اشاعت کا جرم وہ واحد جرم ہے جنہیں آخرت کے ساتھ دنیا میں بھی عذاب کا اعلان کیا گیا ہے۔

بظاہر حالات اس مسلم مملکت میں منکرات و فواحش کی بندش کتنی ہی مشکل۔ لیکن اہلِ دین طبقہ کو خدا کی جناب میں معذرت پیش کرنے کے لیئے تنظیمِ اسلامی کی اس عملی تحریک میں حصّہ لینا ضروری ہے۔

وَاِذۡ قَالَتۡ اُمَّةٌ مِّنۡهُمۡ لِمَ تَعِظُوۡنَ قَوۡمَا ۙ اللّٰهُ مُهۡلِكُهُمۡ اَوۡ مُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا شَدِيۡدًا ‌ؕ قَالُوۡا مَعۡذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ○ (الاعراف: ۱۶۴)

معاشرتی ظلم کے خلاف تحریکِ اخوّت

تنظیم اسلامی کی تحریک ہو یا دوسری مذہبی تحریکات — ان میں دعوتِ دین کا جو پہلو ضمنی اور ذیلی بن کر رہ گیا ہے وہ ہے معاشرتی ظلم کے خلاف کھلا جہاد —

معاشرتی ظلم سے میری مراد نسب اور صہر (ماں باپ اور ساس سسر) کے رشتوں کی حق تلفی ہے — رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نمایاں صفت آپؐ کے پروردگار نے اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيۡمٍ — قرار دی۔ اخلاق — ادائیگیٔ حقوق کا نام ہے۔ حضورؐ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپؐ نے حق اللہ کی مکمل ادائیگی کے علاوہ معاشرتی زندگی کے ایک ایک حق کو ادا فرمایا اور اپنی حیاتِ پاک کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کا مکمل نمونہ اور اسوہ بنا کر پیش کیا۔

ماں باپ بہن بھائیوں کے علاوہ ساس سسر اور سالے سالیوں، بیویوں اور پڑوسیوں، مسلم پڑوسیوں اور غیر مسلم پڑوسیوں کے جو حقوق قرآن کریم نے قائم کیے تھے، آپؐ نے وہ سب ادا فرمائے۔ "انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" کا یہی مطلب ہے۔

صرف یہ کافی نہیں ہے کہ مصلحین امت صرف مسلمانوں کے نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ پر نظر رکھیں۔ شب بیداری اور تلاوت قرآن کے ذریعہ تزکیۂ روح کی کوشش کو کافی سمجھیں، بلکہ ضروری ہے کہ باہمی حقوق کے ایک ایک پہلو پر نگاہ رکھی جائے۔ ماں باپ کے ساتھ اولاد کے اور اولاد کے ساتھ ماں باپ کے تعلقات کیسے ہیں — ساس سسر اور داماد کے درمیان اور ساس سسر اور بہو کے درمیان تعلقات کی کیا کیفیت ہے؟

صرف ایک شخص کو متدین صورت اور پابند نماز دیکھ کر اسے جنت کی سند عطا کر دینا اور شب بیدار دیکھ کر اس کے سر پر خلافت کی پگڑی باندھ دینا اور کسی کو اچھا قاری، اچھا خطیب اور مفتی صاحب دیکھ کر اسے شیخ طریقت بنا لینا — یہ اس حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے کہ اسلام پوری زندگی کی ہدایت ہے۔

دین کا غلبہ پہلے گھر کے باطل (غرور نفس اور غرور خاندان) پر ہوگا۔ اس کے بعد باہر کے باطل پر غلبہ کی راہیں کھلیں گی۔

آج مسلم معاشرہ باہمی حقوق تلفیوں کے ظلم میں گھرا ہوا ہے۔ اور قرآن کریم کی اس وعید شدید کا دل ہلا دینے والا منظر پیش کر رہا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (الانعام: ۱۲۹)

اور دوسری طرف دینی تحریکوں کا یہ حال ہے کہ سارا زور تقریر و تحریر باطل کے خلاف صرف ہو رہا ہے۔

اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نظروں سے اوجھل ہے۔

لا تنزل الرحمة على قوم فيهم قاطع رحم (مشکوٰۃ)

"اس قوم پر خدا کی رحمت نازل نہیں ہوتی جس میں باہمی حقوق کو توڑنے والا موجود ہوتا ہے۔"

یہ تجربہ قطعی طور پر ناکام نظر آتا ہے کہ روزہ نماز کی ظاہری درستگی سے اخلاق و عادات میں صلاح و فلاح کی روشنی پیدا ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے رجوع الی القرآن کی تحریک میں جماعت اسلامی سے وابستہ مخلص نوجوانوں کو شریک کرنے کی پوری کوشش کی لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب

کو اس میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب کی تحریک پاکستان میں اقامتِ دین کی تیاری اور اس کی تربیت ہے۔ اور جماعتِ اسلامی نے جس کام کو چھوڑ دیا اس کی تکمیل ہے۔ پھر بھی تحریکِ رجوع الی القرآن کے وابستگان کو خدا تعالیٰ سے یہ دعا کرنی چاہیئے اور ہم سب مسلمانوں کو بھی کہ جماعت کا نوجوان مسلمانوں میں اسلامی اخوّت پیدا کرنے اور برادرکشی کی فضا ختم کرنے کے کام کو سب کاموں پر ترجیح دے اور انتخابی سیاست میں زیادہ نہ الجھے !! فالحمد للہ علیٰ ذالک

بقیہ : ھدایتُ القرآن

کا سمجھوتہ کسی قیمت پر نہیں ہوتا ہے۔ دنیا کا اصلاً مخالف نہیں ہے، دنیا کی مشغولیتیں تو اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کا ذریعہ ہی بنتی ہیں۔ اللہ کے دین میں کسوٹی چکنی چپڑی باتیں کرنا اور ظاہری مراسم کی پیروی نہیں ہے، بلکہ اصل کسوٹی اپنی خواہش اور فائدہ کو قربان کرکے اللہ کی رضامندی حاصل کرنا اور اس کی مخلوق کو فائدہ پہونچانا ہے۔

۲ھ یہ خدا پرستی کا کردار ہے، جو دنیا میں کتنا ہی مشغول ہو لیکن اس کے پیش نظر اللہ کی رضامندی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس کی خاطر وہ سب کچھ قربان کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ اگرچہ کتنا ہی اپنے نفس سے مقابلہ کرنا پڑے، اپنی خواہش کو قربان کرنا پڑے اور اپنا نقصان برداشت کرنا پڑے۔ یہ کردار ایسا نہیں ہوتا ہے کہ اگر خدا پرستی سے فائدہ پہونچتا رہے تو اس کا نام لیتا رہے اور اگر کوئی آزمائش آجائے اور کچھ قربانی دینے کی نوبت آئے یا اس کی خاطر کچھ نقصان برداشت کرنا پڑے تو فوراً اس سے علیحدہ ہو جاتے۔

۳ھ خدا پرستی کا کردار تو بیشک اس قابل ہے۔ کہ اس کا اعتبار کیا جائے اور اس کو مزید قوت پہونچائی جائے لیکن دنیا پرستی کا کردار تو قابل اعتبار نہیں ہے۔ اس سے کوئی توقع نہیں ہے کہ حق وصداقت کا ساتھ دے یا وہ خود اس پر عمل کرے۔ بادلوں کے سایہ میں اللہ کا موجود ہونا اور فرشتوں کا ساتھ ہونا یہ صورت حال کو سمجھانے کا ایک انداز اور طریقہ ہے جس سے مخاطب کو سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے کہ گویا وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ اور فرشتے اس طرح آکر ان کا کام تمام کردیں، حالانکہ کام تمام کرنے کے لیے نہ اللہ کو اس طرح آنے کی ضرورت ہے اور نہ فرشتوں کو ساتھ لینے کی ضرورت ہے ■

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تالیفِ منیف

'دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر' پر ایک نظر

از قلم : پروفیسر حافظ محمد فاضل

(یہ مقالہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام
سالانہ محاضراتِ قرآنی منعقدہ مارچ ۱۹۹۰ء کے لیے تحریر کیا گیا تھا)

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہِ الکریم ط

مؤلّف علّام کی زیرِ نظر کتاب کی قراءتِ اولیٰ کے موقع پر ایک مجموعی سا تأثر غیر معیاری اسلوب و انداز میں زبان پر آ گیا تھا ۔ ہدیۂ سامعین و قارئین کئے دیتا ہوں ۔

امّتِ بیمار کی تشخیص کا دستور ہے
اس میں تجویز و ہدایت بدرقہ مسطور ہے
ڈاکٹر صاحب مؤلّف ، ہیں فنا قرآن میں
جوہرِ قرآن ہی صفحات میں منثور ہے
کاش امّت کو ہو احساسِ علالت بالشعور
پھر تو تحریرِ معالج ہر طرح مشکور ہے
ہجرِ قرآں سے زوال اور وصلِ قرآں سے عروج
امّتِ خیر البشرؐ کا بس یہی منشور ہے
تِلک الایّامُ نُداوِل ، سنّتِ ربِّ جلیل
لیک مومن ربّ کی تکبیر پر مامور ہے

تالیفِ مذکور جو ابھی تک زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے کے مراحل طے کر رہی ہے اور وہ بھی ابتداء اپنا دو تہائی حصہ بہرحال بقول مؤلف علام مدّظلہ 'بحوالہ ماہنامہ ' حکمت قرآن ' ماہِ

فروری ۱۹۹۰ء، صفحہ ۲۴، مشمولات کتاب، تین حصوں میں منقسم ہیں - جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

۱- مقدّمہ تالیف

۲- حصہ اول - یہ دو ابواب پر مشتمل ہے -
پہلا باب - اسلام کی نشأۂ ثانیہ - کرنے کا اصل کام - اقدامات -
دوسرا باب - فکر مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر - از پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم -

۳- حصہ دوم - یہ چار ابواب پر مشتمل ہے -
پہلا باب - قرآن حکیم قرنِ اول میں اور اس کے بعد --
دوسرا باب - اسلام برعظیم پاک و ہند میں
تیسرا باب - انگریزی دور کے فتنوں کا سد باب - تحریک رجوع الی القرآن اور ترجمہ و تفسیرِ قرآن کے مختلف مکاتبِ فکر -
چوتھا باب - انجمن خدّام القرآن کا موسّس۔

۴- حصہ سوم - دعوت و تحریک کے سلسلے میں مؤلف علام مدّ ظلہ کے مقرر کردہ سنگ ہائے میل اور تفصیلی روئیداد --

انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع کے موقع پر دوسرے پروگراموں کے ساتھ محاضراتِ قرآنی کا سلسلہ بھی ایک اہم پروگرام ہے جس کا موضوع متعیّن ہوتا ہے - اس سال یہ موضوع جناب محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ مؤسّس انجمن و تنظیم کی رفیع الشان کتاب "دعوت رجوع الی القرآن، منظر و پس منظر" کو مقرر کیا گیا ہے اور اس موضوع پر مجھ جیسے ناچیز اور ہیچمدان کو اظہار رائے یا اظہار خیال کی دعوت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ معاملہ تو کسی بلند و بالا شخصیت یا کم از کم مؤلف علام مدظلہ کے مساوی و ہم مرتبہ شخص کو ہی سونپا جا سکتا ہے جبکہ من آنم کہ من دانم - بہرحال الامر فوق الادب کے پیش نظر حاضر خدمت ہوں - ؎ گر قبول افتد زہے عز و شرف - ایک شاعر کا قول ہے -

عَینُ الرِّضَا عَن کُلِّ عَیبٍ کَلِیلَۃٌ   لکنّ عین السخط تبدی المساویا

یعنی پسندیدہ شخصیت کا کوئی عیب نظر ہی نہیں آتا- لیکن جس سے ناراضگی ہو اس کی برائیاں چن چن کر سامنے لائی جاتی ہیں- اور جناب محترم مولف علام مدظلہ کی شخصیت تو میرے نزدیک بلاشبہ پسندیدہ ہے- اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ کسی باقاعدہ منظم دینی و ملی تحریک میں شمولیت کے لئے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی ہے- اس لئے مجھے تو یہ کتاب سراسر نُور ہی نظر آتی ہے- کیونکہ یہ نور (قرآن حکیم) ہی کی تو تشریح ہے- بہرحال اختلاف رائے کی گنجائش تو ہوتی ہے-

تعارف مؤلف علّام مدظلّہٗ بسلسلۂ تالیف

مولف علام محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ کی ذات دور حاضر میں نہ صرف یہ کہ برصغیر پاک و ہند کے دینی و سیاسی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی اپنے مشن کی اشاعت کی وجہ سے مسلسل متعارف ہوتی چلی جا رہی ہے- ہاں البتہ تحدیثِ نعمت کے طور پر مقدمۂ کتاب میں وہ خود اپنا تعارف ان الفاظ میں کرواتے ہیں :

"اللہ تعالےٰ نے اپنے ایک عاجز اور حقیر بندے کو جس نے سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی اور جو کالج کی سطح پر نہ کبھی ادب یا فلسفے کا طالب علم رہا نہ عمرانیات یا اسلامیات کا بلکہ سائنس اور طب کی تحصیل میں مصروف رہا- اِنَّا اَخْلَصْنٰھُمْ بِخَالِصَۃٍ کے مصداق اپنی کتاب و حکمت اور خاص طور پر اس کی نشر و اشاعت کے لئے اس درجہ خالص کر لیا کہ اسے تعلیم و تعلّم قرآن کے سوائے دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہ رہی اور پھر اس کے درسِ قرآن کو اتنا قبول عام بخشا کہ وہ 'عوامی درس قرآن' کے اس خواب کی عملی تعبیر بن گیا جو لگ بھگ نصف صدی قبل چودھویں صدی کے مجدّد اعظم (شیخ الہند اسیر مالٹا مولانا محمود الحسنؒ) نے دنیا سے رحلت کے وقت دیکھا تھا"-

انجمن خدام القرآن، تنظیم اسلامی، قرآن اکیڈمی اور حال ہی میں قرآن کالج جیسے عظیم اداروں کی تاسیس کی بنا پر وہ دینی حلقوں میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اور آپ کی تعمیرِ سیرت اور تکمیلِ شخصیت میں جن عناصر نے خصوصی طور پر حصہ لیا، باجن حضرات سے آپ نے روحانی یا ظاہری طور پر اکتساب فیض کیا، اس کی پوری تفصیل 'تالیف پیش نظر' کے حصہ دوم، باب چہارم میں موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ برصغیر کے فکرِ قرآنی

کے محیط میں چار معروف سلسلوں کا اتصال آپ کی ذات میں بدرجہ اتم موجود ہے - هٰذا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ط

اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ فکر قرآنی کے سلاسلِ اربعہ، میلانِ طبعی اور مسلسل جدوجہد کی بدولت آپ "فنافی القرآن" کے مرتبۂ علیا پر فائز ہیں وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ہ

انتساب و خصوصی غایت تالیف :

مصنف علام تالیفِ کتاب کے انتساب اور خصوصی غرض و غایت کے متعلق مقدمۂ کتاب میں فرماتے ہیں :

"یہ تالیف میں نے ان نوجوانوں ہی کے لئے مرتب کی ہے جو حدیث نبوی خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنالیں - تاکہ ـــ

ا- اس تالیف کے ذریعے انہیں ان موجود الوقت علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی ظروف و احوال کا فہم و شعور بھی حاصل ہو جائے - جن میں انہیں دعوت الی القرآن کا فریضہ انجام دینا ہے - اور

ب- انہیں اپنی اس نسبتِ عالیہ کا ادراک بھی ہو جائے جو خدمتِ قرآن کے ناطے انہیں ان عظیم ہستیوں سے حاصل ہو جائے گی جنہوں نے دعوت رجوع الی القرآن کے شجرہ طیّبہ کی آبیاری کی ہے - اور

ج- انہیں معلوم ہو جائے کہ طلبِ صادق اور عزمِ راسخ کی بدولت، اللہ تعالےٰ ان کے سامنے کیسے کیسے راستے کھولتے چلے جاتے ہیں بمطابق وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ (الآیہ)

عمومی غرض و غایت :

چودہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم اسیرِ مالٹا شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے جیل سے رہائی کے بعد دار العلوم دیوبند میں منعقدہ ایک اہم اجتماع میں حلقہ دیوبند کے جملہ اکابر علماء کی موجودگی میں امتِ مسلمہ کے موجودہ زوال و اضمحلال اور ذلت و نکبت کی تشخیص کرتے ہوئے اس کے دو سبب بیان فرمائے : نمبر ا- قرآن کو چھوڑ دینا - ۲- آپس کے

اختلافات اور خانہ جنگی اور اس کا علاج قرآن کریم کو لفظاً و معناً عام کرنا اور مسلمانوں کا باہمی جنگ و قتال کسی قیمت پر برداشت نہ کرنا تجویز فرمایا- اسی طرح ان کے بعد مفکر اسلام علامہ اقبال مرحوم نے بھی اسی تشخیص و تجویز کے ساتھ مکمل اتفاق کا اظہار کیا تو ان کے معنوی شاگرد و مؤلف کتاب ہذا نے اس تشخیص و تجویز کو عملاً روشناس کروانے کے لئے ' رقم کتاب ' کا اہتمام کیا- اور ایک باقاعدہ تحریک کے ذریعے اس کا عملی نمونہ بھی عوام کے سامنے پیش کیا- تاکہ وہ اسے اپنا کر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں-

اجزاء کی تالیف پر ترتیب وار تبصرہ -

حصہ اوّل : دعوت رجوع الی القرآن موجودہ عالمی تہذیب کے تناظر میں

پہلا باب - اسلام کی نشأۃ ثانیہ - کرنے کا اصل کام -

تحریر و تقریر کا ملکہ ' ایک بہت بڑی نعمتِ خداوندی ہے- بالخصوص جب یہ دونوں کسی ایک ذات میں اکٹھی ہو جائیں تو نورٌ علیٰ نور کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے- مقام حیرت ہے کہ سائنس کا ایک طالب علم ' جو خود معترف ہے کہ اس نے نہ کبھی کالج کی سطح پر ادبیات سے رشتہ قائم کیا ' نہ فلسفہ و منطق کی وادیوں میں جادہ پیمائی کی ' نہ کبھی مباحثوں میں حصہ لیا اور نہ کبھی مضمون نویسی کے مقابلوں میں شریک ہوا - اچانک ایک نہایت ہی سنگلاخ وادی میں داخل ہوتا ہے تو تحریر و تقریر کی شاہراہیں ' اس کے سامنے دست بستہ ایستادہ نظر آتی ہیں - تقریر کے لئے جو موضوع دے دیا جائے فی البدیہہ اس پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار اور تحریر کے لئے جو عنوان پیش کر دیا جائے ' اس پر محققانہ و مبصرانہ مقالہ لکھنے کے لئے ہر آن کمربستہ - تحریر میں روانی ' پختگی ' منطقی استدلال ' عنوان اور معنوں کے درمیان مطابقت نامہ ' ادبیت کی چاشنی اور اسالیب کے تنوع سے مملو و مزیّن - مذکورہ خصوصیات نے ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ ایک عنوان کو پڑھنا شروع کر دیا جائے تو طبیعت مطمئن ہی نہیں ہوتی جب تک اسے مکمل نہ کر لیا جائے - کیونکہ ذیلی عنوانات ' زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے پیوستہ ہوتے چلے جاتے ہیں - ملاحظہ ہو ' فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء ' اس میں عنوان اور معنون کی گہری مطابقت سے خود بخود دوسرا ذیلی عنوان ' بنیادی نقطہ نظر ' پیدا ہو گیا- اور اس کی منطقی توجیہہ کرتے ہوئے ' عالم اسلام

کی بے کسی و بے بسی پر نگاہ پڑتی ہے جو فکرِ مغرب کی یورش کا نشانہ بنتا ہے۔ اب اس کی طرف سے 'مدافعانہ کوشش' ایک فطری تقاضا ہے۔ لیکن موجودہ حالات میں جبکہ علوم عمرانی ارتقاء پذیر ہیں اور سائنسی انکشافات' ایجادات اور اختراعات کا سلسلہ شروع ہے تو خدا کی بجائے کائنات اور روح کی بجائے مادہ تحقیق و تجسّس کا مرکز و محور بنتا ہے۔ حیاتِ اخروی خارج از بحث اور حیاتِ دنیوی غور و فکر کا موضوع قرار پاتی ہے جس سے مختلف عمرانی تصورات اور سیاسی و معاشی نظریات وجود میں آتے ہیں۔ چنانچہ سابقہ نظام ہائے حیات کی جگہ سیاسی میدان میں قوم پرستی' آمریت اور جمہوریت کا رواج ہوتا ہے۔ اور معاشی میدان میں سرمایہ داری اور سوشلزم برسر کار آتے ہیں۔ اور مختلف سیاسی اور معاشی تحریکوں کا آغاز ہوتا ہے۔ عالم اسلام میں بھی اسلام پر بطور' نظام زندگی' غور و فکر شروع ہوتا ہے اور اس نظام کو عملاً نافذ کرنے کے لئے مختلف ممالک میں تحریکوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ تحریکیں جو تقریباً نصف صدی سے برسر عمل ہیں ناکام رہتی ہیں۔ کیوں؟۔ اس پر' تعبیر کی کوتاہی' کا عنوان سامنے آتا ہے۔ اور وضاحت سے بتایا جاتا ہے کہ احیائے اسلام کی شرطِ اول تجدیدِ ایمان ہے اور کرنے کا اصل کام ایک زبردست علمی تحریک کا اجراء ہے۔ اس ضمن میں دو ذیلی عنوانات: کرنے کا اصل کام۔ اور عملی اقدامات کا مطالعہ موضوع زیر بحث کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑتا۔

یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہیں ہوگا کہ عملی اقدامات میں صرف تجاویز پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مصنّف علام مدظلہ نے اس سلسلے میں متعدد اداروں کی تاسیس کا عملی اقدام بھی کر دیا ہے۔ انجمن خدّام القرآن' تنظیم اسلامی' قرآن اکیڈمی اور اب بالخصوص قرآن کالج کا قیام' جس کے آڈیٹوریم میں محاضرات قرآنی اور سالانہ تقریبات کا انعقاد ہو رہا ہے مذکورہ دعوے پر شاہد عدل ہیں۔ فَجَزَاہُ اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَاء

باب دوم۔ فکرِ مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر۔

یہ تحریر پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کی ہے جس میں انہوں نے نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ فکرِ مغرب کی اساس کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کے تاریخی پس منظر پر ایک طائرانہ لیکن ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔ مولف علام مدظلہ نے چونکہ پہلے باب میں فکرِ مغرب کے ہمہ گیر استیلاء کا ذکر چھیڑا ہے' اس لئے فطری طور پر قاری کا ذہن اس کی

اساس اور تاریخی پس منظر کی تلاش میں سرگرداں ہو سکتا ہے - اس لئے یہ تحریر اس کی پریشانی کو ختم کرتے ہوئے اس کے ادراک کی تکمیلی صورت کا اہتمام کرتی ہے - اس لئے اسے پہلے باب کا تتمہ و تکملہ کہا جا سکتا ہے - اس باب میں پروفیسر مرحوم نے تسلیم کیا ہے کہ فلسفہ و منطق اور علم کلام کی وادیوں کی سیر' انسان کو سوائے تشکیک و اضطراب کے کچھ نہیں دے سکتی اور اس وادی میں تقریباً پچاس سال تک بھٹکنے کے بعد بالآخر تصوف کی طرف متوجہ ہونے سے انہیں سکون و اطمینان کی دولت نصیب ہوئی - اسے وہ تجدیدِ ایمان سے تعبیر کرتے ہوئے مولف علام مدظلہ کے پروگرام سے مکمل اتفاق کا اظہار کرتے ہیں -

حصّہ دوم - دعوت رجوع الی القرآن کا تاریخی پس منظر -

باب اوّل - قرآن حکیم قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد -

اس باب کے متعلق مولف علام مدظلہ خود مقدّمۂ تالیف میں فرماتے ہیں کہ "یہ میری محبوب ترین تحریروں میں سے ہے" - بلاشبہ آپ کی ژرف نگاہی قابلِ تحسین ہے' جس نے اس حقیقت کا سراغ لگا لیا کہ تاریخ اسلام کے قرن اول میں ہی بعض فطری اور منطقی اسباب کے نتیجے میں توجہات' قرآن حکیم کی بجائے بعض دوسری چیزوں کی طرف منعطف ہو گئی تھیں اور یہی عمل بعد کے ادوار میں تدریجاً بڑھ کر مہجوریٔ قرآن کی اس کیفیت پر منتج ہوا جس کی نشان دہی حضرت شیخ الہندؒ اور علامہ اقبال نے کی - بہرحال اس باب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے: "واقعہ یہ ہے کہ بدء الاسلام میں دین کی اصل اساسی اور بنیادی حقیقتیں دو ہی تھیں: ۱- قرآن حکیم - ۲- جہاد فی سبیل اللہ - پھر قرآن مجید کی گرج اور کڑک' بقول حالی مرحوم "وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی" کے شواہد' اس کی وہ آیاتِ بینات جو شرک و الحاد کے اندھیروں سے نکال کر ایمان و یقین کی روشنی کی طرف لانے والی ہیں' ان کی خصوصیات اور اس کا موعظہ و شفاء لما فی الصدور ہونا جس زوردار انداز میں پیش کیا ہے حیرت ہوتی ہے - ملاحظہ ہو' فرماتے ہیں: "گویا انذار ہو یا تبشیر' تبلیغ ہو یا تذکیر' موعظت ہو یا نصیحت' تعلیم ہو یا تربیت' تزکیہ ہو یا تصفیہ' تجلیہ ہو یا تنویر' الغرض تطہیر یا تعمیر' محمدؐ رسولِ اللہ کا پورا عملِ دعوت و اصلاح قرآن مجید ہی کے گرد گھومتا ہے" -

مزید زورِ کلام ملاحظہ ہو - صحابہؓ کرام کی زندگیوں میں قرآن مجید نے جو ہمہ گیر تبدیلی پیدا کی اس کے بارے میں فرماتے ہیں :" قرآن نے ان کا فکر بدلا' سوچ بدلی' نقطہ نظر بدلا' اقدار بدلیں' عزائم بدلے' امنگیں بدلیں' شوق بدلے' دلچسپیاں بدلیں' خوف بدلے' امیدیں بدلیں' اخلاق بدلے' کردار بدلے' خلوت بدلی' جلوت بدلی' انفرادیت بدلی' اجتماعیت بدلی' دن بدلا' رات بدلی' حتیٰ کہ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ زمین بدلی الغرض پوری کائنات بدل کر رکھ دی "-

تحریر میں یہ زور قرآن مجید کے فیضان ہی کا اثر ہے -

پھر اس ہمہ گیر تبدیلی کے منطقی نتیجہ "تصادم" سے جہاد فی سبیل اللہ کی ضرورت کا اثبات اور اس سے تکبیر رب کا اعلان اور تنفیذ فی الارض بمطابق وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ منطقی استدلال اور زورِ بیان کی وہ معراج ہے جو نام نہاد دانشوروں اور ادیبوں کی قسمت میں کہاں ؟- یہ تو فنافی القرآن کے مقامِ رفیع کے برکات و نتائج ہیں - وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

قرنِ اول کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :" نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ اور خلافتِ راشدہ کے دوران' اسلام کی نشاۃِ اولیٰ یا غلبۂ حق کا دورِ اول بلاشائبۂ ریب و شک نتیجہ تھا' صحابہ کے تعلق بالقرآن اور جذبۂ جہاد کا - لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں کہ جیسے ہی اسلام نے ایک مملکت اور سلطنت کی صورت اختیار کی ان دونوں کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی اور ایسا ہونا ایک حد تک منطقی اور فطری تھا"- اگرچہ اس تبصرہ سے اختلافِ رائے کی کافی گنجائش موجود ہے تاہم اس کے بعد ان دونوں کی ثانوی حیثیت پر جس حقیقت پسندانہ اور پرسوز انداز میں اظہار خیال کیا ہے اس کا ایک ایک لفظ جڑے ہوئے نگینہ کی حیثیت رکھتا ہے - اور قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور مجموعی طور پر یہ ایک ایسا متن ہے جس کی تشریح کے لئے ایک دفتر درکار ہے -

باب دوم - اسلام برعظیم پاک و ہند میں -

برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے ورود پر تبصرہ کرتے ہوئے مولف علام مدظلہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر اسلام آیا ہی اس وقت جب وہ نشاۃِ اولیٰ کے بعد زوالِ اوّل سے پوری شدت کے ساتھ دوچار ہو چکا تھا اور اس کی وحدتِ فکری بھی پارہ پارہ ہو چکی تھی اور

وحدتِ ملی بھی - ایک طرف عالم اسلام کے قلب میں عرب قوت کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا اور دوسری طرف خلافتِ اسلامی کی توحیدی شان ایک قصہ پارینہ بن چکی تھی اور اس کی جگہ ملوک ' احبار اور رھبان پر مشتمل قدیم تثلیث پوری طرح رائج ہو چکی تھی -

بہرحال برعظیم میں ورودِ اسلام کے وقت اصحابِ سیف وسنان الگ اور صاحبانِ قرطاس و قلم الگ تھے - لیکن ان میں ربط موجود تھا - لیکن جلد ہی یہ ربط کمزور ہوگیا ، بلکہ اس نے تضاد کی صورت اختیار کر لی - مدرسہ و خانقاہ میں بھی منافرت کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی - ایک شدید حنفیت کے زیر اثر تھا تو دوسرا وجودی تصوف کا حامل - قرآن مجید کا تعارف ایک کتابِ مقدس کی حیثیت سے ہوا اور علمِ حدیث سے یہ سرزمین دیر تک نابلد رہی - مسلم انڈیا کا سنہرا دور دورِ غلاماں تھا - اس کے بعد تنزل ہوتا چلا گیا - حتیٰ کہ اکبر اعظم علیہ ماعلیہ کے زمانے میں یہ تنزل اپنی انتہا کو پہنچ گیا - اور عین اس وقت جبکہ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کا خورشیدِ حکومت نصف النّہار پر چمک رہا تھا ** اسلام پر انتہائی غربت اور شدید بے کسی و کسمپرسی کی کیفیت طاری ہو چکی تھی - یہاں تک کہ نام نہاد دین الٰہی نے دین محمدی کی کامل بیخ کنی کرنے یا کم از کم اسے سرزمینِ ہند سے ملک بدر کرنے کا بیڑا اٹھالیا تھا - یہ الگ بات ہے کہ قدرت نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے کہ اسلام کے زوال کی انتہاء اس کی نشأۃ ثانیہ کی تمہید بن گئی -

یہ اقتباسات اور ان کا خلاصہ ' مبصّر کی وسعتِ نظر ' کثرتِ مطالعہ ' حالات کی تبدیلی پر گہری نظر ' اور منطقی نتائج کے استخراج کی فطری صلاحیت پر دلالت کے بیّن ثبوت کے طور پر پیش کئے گئے ہیں - اس کے بعد اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی تمہید کے دعوے کے اثبات کے لئے برعظیم میں تین شخصیتوں کی پیدائش کا ذکر کرتے ہیں : ۱- مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ - ۲- شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ - ۳- امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ - جنہوں نے اپنے مجاہدانہ اور علمی کارناموں سے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا اور ان کا رشتہ پھر سے اصل سرچشمہ قرآن و حدیث سے جوڑ دیا - نوجوانوں کے لئے اپنے اسلاف کے ان کارناموں میں نشانِ راہ موجود ہیں - جو مصنّف علام مدظلہ نے کہیں ایجاز لیکن غیر مخل سے اور کہیں اطناب لیکن غیر ممل سے ' مطالعہ کے لئے ان کے سامنے رکھ دیئے ہیں -

باب سوم: انگریزی دور کے نئے فتنوں کا سدِّ باب، تحریک رجوع الی القرآن اور ترجمہ و تفسیر قرآن کے مختلف مکاتب فکر۔

تاریخی دھارے سے اپنے موضوع و مقصد کے مطابق، مفید جواہر پارے نکال لینے میں مصنف علام کو ایک خاص ملکہ حاصل ہے - اور پھر ان کو ترتیب دے کر نہایت خوبصورت شکل میں قارئین کے سامنے پیش کر دینا، آپ کے حسنِ انتخاب اور حسنِ کارکردگی کی ایک اعلیٰ مثال ہے - فرماتے ہیں :

"ہندوستان میں انگریز کے باقاعدہ عسکری تسلط کا آغاز تو ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کے نتیجے میں گویا شاہ ولی اللہ کی زندگی میں (ان کی وفات سے چھ سال قبل) ہو گیا تھا تاہم اسے ایک باضابطہ کل ہند سلطنت بننے میں پوری ایک صدی لگی - یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں غدر یا بغاوت کی صورت میں آخری ہچکی لے کر ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا ساڑھے چھ صد سالہ دور ختم ہو گیا - اور تاریخ ہند کے برطانوی دور کا آغاز ہو گیا" -

پھر فرماتے ہیں :

" یہ ایک صدی بالخصوص مسلمانانِ ہند کے لئے انتہائی مایوسی کا زمانہ تھا - تحریکِ شہیدین کی بظاہر ناکامی اور ریشمی رومال تحریک کا بے نتیجہ رہنا، مسلمانوں کی مایوسی میں اضافہ کا سبب بنا - اس کے بعد برطانوی دورِ حکومت میں مسلمانانِ ہند زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار رہے - خالص مذہبی میدان میں سب سے پہلے ان کو عیسائی مشنریوں سے سابقہ پیش آیا - عیسائی پادری چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے - یہاں تک کہ عیسائیت کی تبلیغ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر بھی ہونے لگی - سنت الٰہیہ کا ظہور ہوا اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی، جو خاندان ولی اللّٰہی کے چشمے سے سیراب ہو کر ابھرے، انہوں نے پادری فنڈر کی کتاب میزان الحق کا دنداں شکن جواب اظہار الحق نامی کتاب سے دیا تو پادری صاحب کو ہندوستان سے بھاگنا پڑا - عیسائیوں کی دیکھا دیکھی ہندوؤں کی باسی کڑھی میں بھی ابال آیا - اور مسلمانوں پر ان کا حملہ دو صورتوں میں ہوا - پہلی صورت میں آریہ سماجیوں نے مسلمانوں کو للکارا اور سوامی دیانند سرسوتی کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" کی اشاعت سے یہ فتنہ عروج کو پہنچا - اگرچہ علماء حق بھی میدان میں آئے لیکن بدقسمتی سے اس میدان میں نمایاں حیثیت آنجہانی غلام احمد قادیانی کو حاصل ہوئی - ۱۸۸۳ء میں 'سرمہ چشم آریہ' نامی

کتاب لکھ کر اس نے وہ ہر دل عزیزی حاصل کی جو اس کے ظرف سے زیادہ ہونے کے باعث چھلک پڑی - اور خود بھی گمراہ ہوا اور ہزاروں کو گمراہ کر گیا - ہندو حملے کی دوسری صورت راجہ رام موہن رائے کی جماعت برہمو سماج کے فلسفہ وحدتِ ادیان کی شکل میں سامنے آئی جس سے مولانا ابو الکلام جیسی نابغہ روزگار شخصیت بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی -

بہرحال مسلمانان ہند کی مثبت احیائی کوششوں کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز سے ہوا - نگاہوں کا ارتکاز رفتہ رفتہ قرآن مجید پر ہونے لگا - اور امتِ مسلمہ جو کلام اللہ سے بیگانہ ہو چکی تھی دوبارہ اس کی طرف متوجّہ ہونے لگی - اس دور میں رجوع الی القرآن کے ذکر میں مصنف علام مدظلہ ' حق و انصاف کا اظہار کرتے ہوئے ان گروہوں کے حصّہ (Contribution) کا بھی ذکر کرتے ہیں ' جو بعد میں انتہائی غلط راہوں پر چل نکلے - اور ضلّوا واضلّوا کا مصداق بن گئے - مثلاً قادیانی ' چکڑالوی اور پرویزی وغیرہ - ترجمہ و تفسیرِ قرآن کے ضمن میں گزشتہ نصف صدی (ربع آخر گزشتہ صدی و ربعِ اول موجودہ صدی) میں جو کام ہوا ' اس کی ایک فہرست بھی دے دی گئی - جو اگرچہ نامکمل ہے تاہم مفیدِ مطلب ہے - اس کے بعد مصنف علام مدظلہ فرماتے ہیں کہ برصغیر میں اس دوران دو مکتب فکر پروان چڑھے : ۱- علی گڑھ - ۲- دیوبند - دعوت رجوع الی القرآن کے نقطہ نظر سے دونوں کے رنگ الگ الگ نظر آتے ہیں - علی گڑھ کا متجددانہ رنگ سر سید احمد خاں کی تفسیر میں نظر آتا ہے - جبکہ راسخ العقیدہ روایتی انداز کی تفاسیر میں شیخ الہندؒ کا ترجمہ اور مولانا اشرف علیؒ تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ' جس پر مبنی مزید تین تفسیریں ' مولانا عبد الماجد دریا بادی ' مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مولانا مفتی محمد شفیع کی لکھی ہوئی سامنے آچکی ہیں - محمد علی لاہوری ' علامہ عنایت اللہ مشرقی اور غلام احمد پرویز کی تفاسیر ' فکرِ سر سید ہی کی شاخیں ہیں -

مزید فرماتے ہیں کہ علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے درمیان فکرِ قرآنی کے تین اور سوتے پھوٹتے ہیں : ۱- علامہ اقبال مرحوم کی ترجمانیٔ قرآن اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی تشریح - ۲- مولانا ابو الکلام آزاد کا ترجمان القرآن اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن اور ۳- مولانا حمید الدین فراہی کا طریق تدبّرِ قرآن -

یہ تینوں دھارے بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوصف ' ایک

دوسرے کے جذب و انجذاب کا شدید میلان رکھتے ہیں - ان میں سے آخری دو دھارے تو ایک ہی چشمے سے سیراب ہوئے ہیں - اور وہ چشمہ ہے مولانا شبلی نعمانی جنہوں نے ان دونوں کی پرورش کی ہے - الغرض ایک طویل تاریخی دور کا ایک مخصوص نقطہ نظر سے اتنا جامع تجزیہ ' مصنف علام مدظلہ پر مطالعہ قرآن کا فیضانِ نظر ہے ' جس میں جرح کا تو دخل ہی نہیں ، البتہ تعدیل کے مراحل میں اضافہ ناگزیر ہے -

باب چہارم - انجمن خدّام القرآن کا مؤسّس -

عنوان سے واضح ہے کہ اس باب میں مصنف علام مدظلہ نے خود اپنا تعارف اس طریقے سے کروایا ہے کہ فکر قرآن کے مذکورۃ الصدر مختلف دھاروں سے انہیں استفادہ کی صورت کس طرح میسر آئی - چنانچہ فرماتے ہیں :

" الغرض راقم (مصنف علام) کے فکر و نظر پر ھو الاول و الاخر کے مصداق ابتدائی اور تکمیلی چھاپ ہے علامہ اقبال مرحوم کی - ان میں سے ابتدائی تاثر زیادہ تر جذباتی ہے ، جس کا حاصل ہے جذبۂ ملی - اور تکمیلی رنگ خالص فکری ہے ، جس کا موضوع ہے فکرِ جدید کے پس منظر میں قرآن حکیم کا مطالعہ یا قرآن حکیم کی روشنی میں فکر جدید کا جائزہ و تجزیہ - اور ان کے مابین رواں ہیں مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم 'سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کی قرآنی دعوتِ جہاد و انقلاب اور امام حمید الدین فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے طریق تدبر قرآن اور حضرت شیخ الہند اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے عِلم راسخ کے کوثر و تسنیم ایسے چشمے " ذالک فضل اللہ یو تیہ من یشاء و اللہ ذو الفضل العظیم"

فکر قرآنی کے ان سلاسل کے بانی حضرات تک رسائی اور ان سے اکتسابِ فیض کی تفصیل اور کچھ بزرگوں سے وصل کے بعد فصل کی داستان بھی اس باب میں مذکور ہے - ع

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ -

بحیثیت مجموعی تالیف پر نظر :

کتاب کے تفصیلی تجزیہ کے بعد اب بحیثیت مجموعی ' اختلافِ رائے کا حق استعمال کرتے ہوئے چند ایک اشکالات یا ابہامات کی نشان دہی کی جاتی ہے جن کی وضاحت اگر ہو جائے تو کتاب کی افادیت میرے نقطہ نگاہ سے کہیں بڑھ سکتی ہے - -

۱- مرض کے سبب ' مہجورئ قرآن کی جامع اور مانع تعریف نہیں کی گئی جو نہایت ضروری ہے -

۲- مہجورئ قرآن کے آغاز کو مملکت اور سلطنت کے قیام سے متعلق قرار دیا گیا ہے جو خود مبہم اور وضاحت طلب ہے -

۳- کیا قرآن مجید ' خود مملکت کے قیام کا داعی نہیں ؟- اور اگر ہے تو اس سے مہجورئ قرآن کا دعوٰی کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے ؟-

۴- اگر قرآن کسی معاشرے کے عدالتی نظام میں موجود ہو تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ معاشرہ قرآن کو چھوڑ چکا ہے ؟-

۵- قرآن مجید کے لئے ' یکے از ادلہ اربعہ ' کی ترکیب کا استعمال غیر مستحسن ہے کیونکہ یہ ترکیب تو ادلہ اربعہ کے باہم مساوی اور ہم مرتبہ ہونے پر دلالت کرتی ہے جبکہ علماء کے اصول کے نزدیک دلیل تو وہی ہے - باقی تو اس کے توابع ہیں !-

۶- کیا تلاوتِ قرآن مجید اور تعلیمِ قرآن مجید سے خود بخود ایمانِ حالی یعنی حقیقی حاصل ہو جاتا ہے - قرآن مجید کے بیان کردہ فرائضِ نبوت میں تلاوتِ آیات کے بعد اور تعلیمِ کتاب و حکمت سے قبل ایک اور فریضہ ' تزکیہ ' کا ذکر ہے - کیا حقیقی ایمان کا تعلق اس کے ساتھ تو نہیں - اور حضرت ابن عباس کے قول تَعَلَّمْنَا الْاِیْمَانَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْآنَ کا مفہوم بھی اسی سے متعلق تو نہیں ؟-

۷- علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر علم و حکمت از کتب ' دیں از نظر

یہ "نظر" کیا ہے - آیا ہماری تحریک میں اس کا بھی کچھ اہتمام ہے ؟-

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین -

احقر العباد حافظ محمد فاضل عفی عنہ
پروفیسر قرآن کالج لاہور

ذرا سوچیئے!

مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کا قول ہے کہ :

❖ اگر تم چاہتے ہو کہ کوئی دنیا کا ہو کر رہ جائے اور دین کا نہ رہے تو اسے کسی طبیب کے حوالہ کر دو۔

❖ اگر تم چاہتے ہو کہ کوئی دین کا ہو کر رہ جائے اور دنیا کا نہ رہے تو اسے کسی صُوفی کے حوالہ کر دو۔

❖ اگر تم چاہتے ہو کہ کوئی نہ تو دین کا رہے نہ دُنیا کا، تو اسے کسی شاعر کے حوالہ کر دو۔

اور مَیں اس میں یہ اضافہ تجویز کرتا ہوں کہ:

★ اگر تم چاہتے ہو کہ دین اور دُنیا دونوں کی بھلائیاں کسی کے حصّے میں آئیں تو اُسے **قرآن کالج** کے حوالہ کر دو۔

سوچیئے کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟

دعوتِ فکر منجانب
لطف الرّحمٰن خاں
ناظم قرآن کالج ۔ لاہور

لغات واعرابِ قرآن (۱۲)

پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرہ (۷)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورت کا قطعہ نمبر (جو زیرِ مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم ـــ (وھکذا)۔

۲:۷ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

۲:۷:۱ اللغۃ:

۲:۷:۱ (۱) [وَ] "وَ" کے مختلف معانی اور استعمالات پر الفاتحہ: ۴ میں بات ہو چکی ہے۔ دیکھیے ۱:۴:۱ (۳) ـــ وہاں واو کی چار قسموں اور ان کے اردو ترجمہ پر بات ہوئی تھی یعنی واوالعطف، واوالقسم، واوالحال اور

واوالمعیت ۔ اب یہاں " واو " کی ایک نئی قسم یا نئے استعمال کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ لغوی اسے واوالاستیناف کہتے ہیں جس کا مطلب ہے نئی عبارت یا نیا مضمون شروع کرنے والی " وَ " ـــ اردو میں واوالعطف (واو عاطفہ) اور واوالاستیناف (یا واو مستأنفہ) ـــ دونوں ـــ کا ترجمہ " اور " سے ہی کرنا پڑتا ہے مگر مفہوم کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے ۔ واوالعطف دو چیزوں (معطوف اور معطوف علیہ) کو ایک ہی حکم (بلحاظ مضمون) میں جمع کرتی ہے مگر واوالاستیناف دو مضمونوں کو علیحدہ کرتی ہے اور اس سے ایک الگ جملے کی ابتداء ہوتی ہے ۔ (اور استیناف کے معنی ہی " نئے سرے سے بات شروع کرنا " ہی ہوتے ہیں) ـــ اس کی مثال ہی لیجئے ۔ اگر ہم یہاں سابقہ آیت کے آخری الفاظ اور زیر مطالعہ آیت کے ابتدائی الفاظ کو ساتھ ساتھ لکھیں اور درمیانی واو کو عاطفہ سمجھ لیں تو " لھم عذاب عظیم ومن الناس من ...... " کا ترجمہ ہو جائے گا " ان کے لئے بڑا عذاب ہوگا اور لوگوں میں سے وہ بھی جو .... " ـــ اس ترجمہ کا کوئی تک نہیں بنتا ـــ لہٰذا ہم یہاں " وَ " کو مستأنفہ قرار دے کر یہاں سے ایک نئے مضمون کی ابتداء کریں گے ـــ دراصل ایسے موقع پر " وَ " کا اصل مفہوم " اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ...... " کی قسم کا ہوتا ہے مگر عام اردو محاورے میں نیا جملہ بھی " اور " سے شروع کرنے پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے ۔

ا : ۷ : ۱ (۲) [مِنَ] یہ دراصل " مِنْ " ہی ہے جسے آگے " النّاس " کے " نون " ساتھ ملانے کے لیے (کیونکہ " النّاس " کا ابتدائی " الف " تو ہمزۃ الوصل ہے اور " ل " اس وجہ سے خاموش ہوگا کہ اس کے بعد " ن " حرف شمسی ہے) مِنْ کے ساکن " ن " کو حرکت دی گئی ہے ۔ کسی حرف ساکن کو آگے ملانے کے لیے عموماً کسرہ (ـِ) کی حرکت دی جاتی ہے تاہم کبھی فتحہ (ـَ) یا ضمہ (ـُ) سے بھی ملا دیتے ہیں ۔ دراصل یہ عربوں کے تلفظ کے طریقے پر منحصر ہے ۔ یہاں یہ فرق قابلِ ذکر ہے کہ " مَنْ " موصولہ یا استفہامیہ (بمعنی جو کہ یا کون ؟) کو آگے ملانا پڑے تو نون کو کسرہ

(ـــ) دیتے ہیں مگر " مِنْ " (بمعنی میں سے) کو آگے ملانا ہو تو اس کے "نون" کو ہمیشہ فتحہ (ـَـ) کے ساتھ ملاتے ہیں۔ قرآن کریم میں تو خیر حرکات لگی ہوئی ہیں۔ بغیر حرکات کی عبارت کے درست تلفظ کے لیے اس قسم کے قواعد (مثلاً مَنْ اور مِنْ کو آگے ملانے کا فرق) ہی قاری (اور عربی دان قاری) کو مدد دیتے ہیں۔

● " مِنْ " مشہور حرف الجر ہے۔ موقع استعمال کے لحاظ سے اس میں جو مختلف معنی پیدا ہوتے ہیں ان پر ہم البقرہ : ۲ میں بات کر چکے ہیں۔ [دیکھئے ۲:۲:۱(۵) میں] ـــ زیر مطالعہ آیت میں " مِن " تبعیض کا ہے یعنی یہاں اس کا ترجمہ "..... میں سے (بعض) " کے ساتھ ہو گا۔

۲:۷:۱(۳) [النَّاسِ] اس لفظ (الناس) کے مادہ اور وزن کے بارے میں اہل لغت نے متعدد اقوال بیان کئے ہیں جن کی تفصیل یوں ہے:

ا۔ پہلا قول یہ ہے کہ اس کا مادہ " ن و س " اور وزن اصلی ـ لام تعریف نکال کر ـــ " فَعَلٌ " ہے یعنی اس کی اصل شکل " نَوَسٌ " تھی جس کی "و" متحرکہ ماقبل کے مفتوح ہونے کی وجہ سے " الف " میں بدل گئی اور اس طرح لفظ " ناسٌ " بنا جو معرف باللام ہو کر " الناس " ہو گیا ہے۔ یہ لفظ اکثر معرف باللام ہی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ تقریباً دو سو چالیس (۲۴۰) جگہ آیا ہے اور ہر جگہ معرف باللام (الناس) ہی آیا ہے۔ کبھی کبھار یہ لفظ بصورت نکرہ " ناسٌ " بھی استعمال ہوتا ہے۔ تاہم یہ بصورت نکرہ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا البتہ عربی اشعار وغیرہ میں آیا ہے۔ اس مادہ (ن و س) سے فعل ثلاثی مجرد ناس ینوس نوسًا (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے معنی " ہلنا " (حرکت کرنا) اور " ہانکنا " ہوتے ہیں۔ تاہم یہ فعل بھی قرآن کریم میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔ معاجم (ڈکشنریوں) میں عموماً یہ لفظ (الناس) اسی مادہ (نوس) کے تحت ہی بیان کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ (ناسٌ) "قوم" اور " رھط " کی طرح اسم جمع کا لفظ سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس (الناس) کا مادہ " ان س" ہے جس سے فعل ثلاثی مجرد " اَنَسَ یأنِسُ اَنساً (باب ضرب سے) اور اَنِسَ یأنَسُ اَنَسا (باب سمع سے) اور کبھی اَنُسَ یأنُسُ اُنساً (باب کرم سے) آتا ہے۔ اور تینوں میں اس کے معنی " مانوس ہونا " ، " ساتھ رہ کر خوش ہونا" ہوتے ہیں۔ یہ فعل بھی بصورت مجرد تو قرآن کریم میں مستعمل نہیں ہوا۔ البتہ اس کے مزید فیہ کے ایک آدھ باب سے کچھ صیغے آئے ہیں۔ جن کا بیان اپنی اپنی جگہ آئے گا۔ ان شاء اللہ۔ اس مادہ (انس) سے ہی لفظ " اِنسان " اور " اِنسِیٌّ " واحد کے لیے اور " اِنسٌ " جمع کے لیے (عموماً پوری جنس بشریت کے لئے) استعمال ہوتے ہیں۔ پھر " انسان " اور " اِنسِیٌّ " دونوں کی جمع تو " اَنَاسِیٌّ " (غیر منصرف) آتی ہے۔ اور صرف کلمہ " اِنسٌ " کی جمع (اگرچہ وہ خود بھی بمعنی جمع ہی استعمال ہوتا ہے) " اُنَاسٌ " (بروزن فُعَالٌ) آتی ہے۔ یہ تمام الفاظ (انسان۔ اِنسِیّ۔ اِنسٌ اور اُنَاسٌ) قرآن کریم میں وارد ہوئے ہیں اور ہر ایک کا بیان اپنی جگہ آئے گا۔

● اسی طرح جو اہل علم لفظ " الناس " کا مادہ " ان س " بتاتے ہیں ان کے نزدیک اس کی اصل۔ ناس کی معرف باللام شکل ' " الاُناس" ہے جو کثرتِ استعمال سے " الناس " ہوگیا۔ جیسے بقول بعض " الاِلٰہُ " سے " اللّٰہ " بن گیا (دیکھئے ۱:۱:۱ (۲) بسم اللہ کی بحث میں)۔ اس صورت میں یہ (الناس) اسم جمع نہیں بلکہ معرف باللام صیغۂ جمع ہی ہے۔ "الناس" کے برعکس لفظ "اناسٌ" اکثر نکرہ ہی استعمال ہوتا ہے۔ کبھی کبھار عربی اشعار میں یہ معرف باللام (الاناس) بھی استعمال ہوا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں یہ لفظ ہمیشہ بصورت نکرہ (اناسٌ) ہی استعمال ہوا ہے۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ " الناس" کا مادہ " ن ی س " ہے اور اس کا وزن اصلی " فَعِلٌ " یا " فَعَلٌ " ہے۔ یعنی اصل شکل " نَیِسٌ " یا " نَیَسٌ " تھی جو " واو " یا " یاء " کے الف میں بدلنے کے مشہور

صرفی قاعدہ (واو یا یاء متحرکہ ماقبل مفتوح الف میں بدل جاتی ہے) کے ماتحت " ناس " ہو گیا اور یہ بھی اسم جمع ہی ہے۔ اور اس قول کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ بعض قراءات (مثلاً الدوری عن کسائی کے ہاں) یہ لفظ (الناس) امالہ کے ساتھ " النیس " (بروزن " دیس ") پڑھا جاتا ہے۔ تاہم اس مادہ " ن ی س " سے کوئی فعل ۔مجرد یا مزید فیہ ــــ عربی زبان میں استعمال نہیں ہوتا۔ اور امالہ کرنے والے بھی اسے ہر جگہ امالہ کے ساتھ نہیں پڑھتے۔ گویا بات مادہ کی نہیں بلکہ روایت قرارت کی پابندی کی ہی ہے۔

۴۔ چوتھا قول یہ ہے کہ اس (الناس) کا مادہ " ن س ی " ہے جس سے فعل ثلاثی مجرد " نسِی ..... ینسی نسیاناً (سمع سے) زیادہ تر بمعنی " بھول جانا یا بھلا دینا " قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔ اس صورت میں لفظ " الناس " کی اصلی شکل " النَسْیُ " یا " النَسَیَ " تھی یعنی اس کا وزنِ اصلی فَعْلٌ یا فَعَلٌ تھا۔ پھر لام کلمہ کو عین کلمہ کی جگہ کر دیا گیا ــ [اور کثرت استعمال کی بناء پر الفاظ میں اس طرح کے ' قلب ' یعنی الٹ پلٹ کی مثالیں عربی زبان میں بکثرت ملتی ہیں۔ جیسے پنجابی میں " چاقو " کو " قاچو " کہہ دیتے ہیں] اور یوں یہ لفظ " النَیَس " ہو کر پھر " الناس " بن گیا۔ اور اُس کا وزن الٹ کر " فَلَعٌ " رہ گیا ہے۔ اور اس لفظ کی یہ اصل بھی امالہ کی ایک وجہ ہو سکتی ہے ــــ اور بقول بعض اس لفظ (الناس) کی اسی مادے (ن س ی) سے اصل شکل " اِنْسِیان " بروزن " اِفْعِلان " ہے جس میں تبدیلی ہو کر " انسان " بنا۔ ــــ پھر اس کی جمع " اَنَاس " معرف باللام ہو کر " الناس " بن گئی۔

● اور اس مادے (نسی) کے بارے میں علمی دلیل سے زیادہ ایک شاعرانہ توجیہ یہ بھی ہے کہ فعل " نسِیَ " سے اسم الفاعل " ناسٍ " (بھول جانے والا) بنتا ہے اور چونکہ ابوالبشر آدم علیہ السلام کے فرمانِ الٰہی کو بھول جانے کا ذکر قرآن کریم (طٰہٰ : ۱۱۵) میں آیا ہے۔ اسی سے تلمیحاً یہ کہا جاتا ہے کہ " اوّل الناسِ اَوّلُ ناسٍ " (پہلا انسان پہلا بھول جانے والا تھا) ــــــ

——، بہرحال مادہ جو بھی ہو لفظ " الناس " یا تو اسم جمع ہے یا صیغۂ جمع ہے۔ اور اس کا موزوں اردو ترجمہ " لوگ " ہے جو اردو میں بھی اسم جمع ہے۔ (لوگ آئے)۔ اگرچہ بعض افعال کے ساتھ (اردو میں) اس کی جمع " لوگوں " بھی مستعمل ہے۔

۲ : ۷ : ۱ (۴) [مَنْ] یہ ایک مبنی (بر سکون) اسم ہے (یعنی اس کا آخری " ن " ہمیشہ ساکن ہی ہوتا ہے سوائے اس کے کہ کبھی آگے ملنے کے لیے اس کو کسرہ (ـِـ) دی جاتی ہے) — اس کے معانی اور مواقعِ استعمال بھی متعدد ہیں جن کی تفصیل یوں ہے :

۱۔ کبھی یہ " مَنْ " استفہامیہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کا اردو ترجمہ " کون ؟ " سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ عربی زبان میں یہ (مَنْ) واحد تثنیہ جمع مذکر مؤنث سب کے لیے آتا ہے (انگریزی ? Who کی طرح)۔ اگرچہ اردو میں حسبِ موقع اس کے لیے مختلف الفاظ مثلاً " کون " یا " کس " استعمال ہوتے ہیں۔ اور کبھی عبارت میں زور پیدا کرنے کے لیے " مَنْ " کے ساتھ " ذا " لگا دیتے ہیں یعنی " مَنْ ذا " ؟ — یہ " ذا " دراصل " ھٰذا " کی مخفف (بلکہ اصلی) شکل ہے [دیکھئے ۲ : ۱ : ۱ (۱)] اور اس کی اردو میں مثال ایسی ہے جیسے کہیں " یہ کام کس نے کیا ؟ " اور زور دینے کے لیے کہیں " کون ہے جس نے یہ کام کیا ؟ " — اور کبھی " مَن ؟ " یا " مَن ذا ؟ " کے بعد آنے والے فقرے کے بعد " اِلّاَ " لگا کر ایک اور فقرہ لاتے ہیں جس سے اس میں استفہام انکاری یعنی نفی کے معنی پیدا ہوتے ہیں اس وقت " مَنْ " یا " مَنْ ذا " کا اردو ترجمہ " کون " یا " وہ کون ہے جو " کے ساتھ کرنے کی بجائے " کوئی نہیں جو " کے ساتھ کرنا زیادہ موزوں لگتا ہے جیسے " من یغفرُ الذّنوبَ اِلّا اللّٰهُ " (آل عمران : ۱۳۵) اور " مَنْ ذاالّذی یشفع عندَہ اِلّاَ باِذنہ " (البقرہ : ۲۵۵) میں آیا ہے۔ " مَنْ " کے

اس قسم کے استعمالات پر اپنی اپنی جگہ وضاحت ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ ۔

۲ ۔ کبھی " مَنْ " موصولہ ہوتا ہے جو " الذی " کے معنی میں آتا ہے البتہ لفظی فرق یہ ہے کہ " مَنْ " واحد تثنیہ جمع مذکر مؤنث سب کے لیے استعمال ہوتا (اتفاق سے اس استعمال (موصول ہونے) کے لحاظ سے بھی "مَنْ" انگریزی کے " Who " کی مانند ہی ہے) ۔ اور مبنی ہونے کے باعث یہ تینوں حالتوں یعنی رفع نصب جر ۔ میں یکساں رہتا ہے جب کہ " الذی " کی مختلف صورتیں ہیں [دیکھئے ۱ : ۶ : ۱ (۱)] نیز یہ (مَنْ) زیادہ تر عاقل اشیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ اس (مَن موصولہ) کا عام اردو ترجمہ تو " جو " ہے ۔ تاہم عدد، جنس اور بعض افعال کی مناسبت سے حسب موقع اس کا ترجمہ " جو کہ " ، " جس نے (کہ) " " جس کو " ، " جس کا " ، " جنہوں نے " ، " جن (سے/کا/کو) " کے ساتھ کر لیا جاتا ہے ۔ اس میں عموماً معرفہ کے معنی ہوتے ہیں یعنی اس کا ترجمہ " وہ جو " یعنی " وہ (خاص) آدمی یا لوگ جو " ہونا چاہیئے تاہم کبھی کبھی یہ (من موصولہ) نکرہ موصوفہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے اس وقت اس کا اردو ترجمہ " کوئی ایسا جو " ، یا " بعض ایسے جو " سے کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے

۳ " مَن " کا ایک استعمال " شرطیہ " کا ہے یہ (مَن شرطیہ) اپنے بعد آنے والے فعل (مضارع) اور شرط کے جواب میں آنے والے فعل (مضارع) (دونوں) کو جَزْم دیتا ہے جیسے " مَن یعمل سوءًا یُجْزَ بِہ " (النساء:۱۲۳) میں اس وقت اس کا اردو ترجمہ " جو کوئی بھی " ، " جس کسی نے بھی " وغیرہ کے ساتھ کرنا چاہیئے ۔ اور چونکہ شرط میں ہمیشہ مستقبل کا مفہوم ہوتا ہے (شرط ماضی کے بارے میں تو ہو ہی نہیں سکتی) اس لیے اگر " مَنْ " شرطیہ کے ساتھ فعل ماضی بھی آئے (جیسے " مَنْ عَمِلَ صَالِحًا ... " (المؤمن: ۴۰) میں) تو بھی اس کا اردو ترجمہ فعل مستقبل کے ساتھ ہی کیا جانا چاہیئے ۔

" مَنْ " کی ان تین معروف اقسام (استفہامیہ ، موصولہ اور شرطیہ)

اور ان کے مواقع استعمال کو ذہن میں رکھئے۔ آگے چل کر یہ چیز کسی عبارت کے اعراب اور معنی سمجھنے میں مدد دے گی۔

۲ : ۷ : ۱ (۵) [یَقُوْلُ] کا مادہ " ق و ل " اور وزن اصلی " یَفعُلُ " ہے یعنی اس کی شکل اصلی " یَقْوُلُ " تھی۔ جس میں عربوں کے تلفظ — یا صرفی قاعدہ — کے مطابق " و " کی حرکت (ـُـ) ماقبل ساکن (ق) کو دے کر خود " واو " کو اس حرکت کے موافق حرف میں بدل دیتے ہیں۔ جو موجودہ صورت میں " واو " ہی رہتی ہے۔ اس طرح یَقْوُل — یقُول میں بدل جاتا ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " قال یقول قولاً۔ دراصل قَوَل یَقْوُل قولاً — (باب نصر سے) آتا ہے جس کا عام مصدری اردو ترجمہ " کہنا " ہے۔ تاہم سیاق و سباق اور مضمون کی مناسبت سے بعض دفعہ اس کا ترجمہ " فرمانا " اور کبھی " عرض کرنا " یا کسی اور مناسب فعل سے بھی کر لیا جاتا ہے یہاں " یقولُ " فعل مضارع کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے جس کا ترجمہ " کہتا ہے " ہوگا۔ اس فعل (قالَ) کے مفعول (یعنی کیا کہا ؟) کے لیے عموماً تو کوئی جملہ ہی آتا ہے لیکن اگر جملے کی بجائے کوئی " اسم " آجائے تو وہ مفعول بنفسہ (بغیر صلہ کے) آتا ہے (للہٰذا منصوب ہوتا ہے) ۔ جیسے " واللّٰہُ یقول الحقَّ " (الاحزاب : ۴) اور " قالوا سلامًا " (ھود : ۶۹) میں اور جس " سے " بات کی جائے (یعنی مخاطب) تو اردو کے اس " سے " (کہا) کے لیے عربی میں فعل " قال " کے بعد لام الجر (لِ) بطور صلہ کے آتا ہے جیسے " قالَ موسیٰ لِقومِہ (الاعراف : ۱۲۸) میں۔ خیال رہے " قالہٗ " کا مطلب ہے " اس نے وہ (بات) کہی " اور " قال لہٗ " کے معنی ہیں " اس نے اس سے کہا "۔ ایسے موقع پر اردو کے " سے " کا ترجمہ عربی میں " مِنْ " سے کرنا شدید غلطی ہوگی اور مخاطب کو مفعول بنفسہ سمجھ لینا بھی ویسی ہی غلطی ہے۔

اس فعل ثلاثی مجرد (قال یقول) کے مختلف صیغے ، مصدر اور بعض

مشتقات قرآن کریم میں نہایت کثرت سے وارد ہوئے ہیں اور مزید فیہ کے ایک باب (تفعل) سے بھی ایک دو صیغے آئے ہیں۔

۲:۷:۱ (۶) [**اٰمَنَّا بِاللّٰهِ**] جو " آمَنَّا " (جس پر ابھی بات ہوگی) + بِ (بمعنی "پر") + اللّٰه کا مرکب ہے۔ اس میں کلمہ "آمَنَّا" کا مادہ "أ م ن" اور وزن اصلی "أَفْعَلْنَا" ہے اور اس کی شکل اصلی "أَأْمَنْنَا" تھی۔ جس میں "اجتماعِ همزتین" کے باعث "أَأْ" بدل کر "ءَا" یا "آ" یا "ا" ہوگیا (اس کے ہم پر آگے بات ہوگی)۔ اور دو "نون" بھی مدغم ہوکر "نَّا" کی صورت اختیار کر گئے اور یوں یہ لفظ "آمَنَّا" بنا ۔۔۔ اس مادہ (امن) سے فعل ثلاثی مجرد کے معانی واستعمال ۔۔۔ بلکہ اس کے باب افعال (آمن یُؤمن ایمانًا) کے معنی پر اور اس کے صلہ "بِ" کے استعمال پر بھی البقرہ : ۳ میں بات ہوچکی ہے [دیکھئے ۲:۲:۱(۱)] "آمنّا" اسی باب افعال سے صیغہ جمع متکلم (فعل ماضی) ہے اور اس کے ساتھ "بِاللّٰه" لگنے سے اس (آمنّا باللّٰه) کا لفظی ترجمہ تو ہوگا "ہم ایمان لائے اللّٰہ پر" جسے سلیس اردو میں "ہم اللّٰہ پر ایمان لائے" کی شکل دی جاسکتی ہے۔ جب کہ بعض مترجمین نے اردو محاورے کو مدِنظر رکھتے ہوئے "ہم ایمان رکھتے ہیں" سے بھی ترجمہ کیا ہے جو مفہوم کے لحاظ سے درست سہی مگر وہ "آمنّا" سے زیادہ "نؤمن" کا ترجمہ لگتا ہے۔

۲:۷:۱ (۷) [**وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ**] اس میں ابتدائی "وَ" تو عاطفہ (بمعنی "اور") ہے اور "باء (بِ) فعل "آمَنَّا" کا صلہ مکرر (برائے) تاکید آیا ہے۔ اس کی وجہ سے اردو ترجمہ میں "پر بھی" کا اضافہ ہوگا ۔۔۔ یعنی "الیوم الآخر" پر بھی (ایمان لائے)"۔ کلمہ "اَلْيَوْم" جو یہاں معرف باللام ہے کے مادہ، وزن وغیرہ پر الفاتحہ : ۴ کے ضمن میں ۱:۳:۱(۲) میں بات ہوچکی ہے۔ یہاں بھی اس کا ترجمہ "یوم الدین"

کی طرح " دن " سے کرنا ہی زیادہ موزوں ہے اور اکثر مترجمین نے یہی کیا ہے۔ دوسرے کلمہ (" الآخِرِ ") کے مادہ، وزن، اشتقاق اور معنی کی بحث اس سے پہلے البقرہ : ۴ کے کلمہ " آخرۃ " کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ دیکھئے ۲:۳:۱(۵)۔ لفظ " آخِر " مذکر اور " آخِرۃ " مؤنث ہے (اردو میں یہی لفظ بصورت " آخرت " ۔ لمبی " ت " کے ساتھ لکھا جاتا ہے)۔ اس طرح اس مرکب توصیفی (الیوم الآخر) کا لفظی ترجمہ تو " سب سے آخر پر آنے والا دن " ہونا چاہیئے مگر اصطلاحی معنوں (جس پر لفظ " آخرۃ " میں بات ہو چکی ہے) اور اردو محاورے کو سامنے رکھتے ہوئے بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ " روزِ آخرت " کیا ہے۔[۱] بعض نے لفظی ترجمہ سے قریب رہنے کے لیے اس کا ترجمہ " پچھلا دن " کیا ہے۔ بعض نے " آخری دن " کو اختیار کیا ہے۔ جب کہ بعض بزرگوں نے مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے " قیامت کا دن " ترجمہ کیا ہے جو بظاہر لفظی ترجمہ سے زیادہ دور ہے۔ اگرچہ مفہوم درست ہے

۲:۷:۱(۸) [وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ] یہ ایک پورا جملہ ہے جس کے کلمات کی الگ الگ تفصیل یوں ہے:۔

● " وَ " یہاں عاطفہ بمعنی " اور " بھی ہو سکتی ہے تاہم یہاں اسے حالیہ (واو الحال) سمجھنا زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے اکثر مترجمین نے یہاں اس کا ترجمہ " حالانکہ " کے ساتھ کیا ہے۔ ایک آدھ نے اس کا ترجمہ " مگر " سے بھی کیا ہے یعنی " لکن " کے معنوں میں لیا ہے اور یہ محاورے کے لحاظ سے ہی درست ہے۔

● اگلا کلمہ " ما " یہاں مشابہ " بلیس " یعنی " الحجازیہ " ہے اور جملے میں نفی کے معنی کے لیے اس کا ترجمہ " نہیں " (ہیں / ہے) ہوگا۔ اس کے بعد " هُمْ "

---

[۱] فارسی کا لفظ " روز " اور عربی کا " یوم " اردو کے " دن " کی طرح بعض تراکیب میں اردو میں بھی مستعمل ہیں۔ مثلاً " روزِ روشن " ۔ " یومِ افواج " وغیرہ۔

ضمیر جمع ہے جس کا اردو ترجمہ " وہ " ہے۔ جملے کے آخری حصہ " بِمُؤمِنِیْن" کی ابتدائی باء (بِ) تو وہ ہے جو "ما" یا "لیس" کی خبر کے شروع میں لاتے ہیں۔ اس 'باء' کا اردو میں کوئی ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس سے عبارت میں ایک زور اور تاکید کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

● لفظ " مؤمنین " باب اِفعال۔ آمَنَ یؤمِن ایماناً سے اسم الفاعل " مؤمِنٌ " کی جمع مذکر سالم ہے یعنی " ایمان لانے والے "۔ اس کے مادہ (امن) اور معنی وغیرہ پر البقرہ : ۳ میں بات ہو چکی ہے۔ دیکھئے ۲:۲:۱ (۱)

● لفظ "مومنین" کا ترجمہ " ایمان لانے والے" یا صرف " ایمان والے" بالکل درست ہے اس لیے کہ عربی مصدر " ایمان" اردو میں اپنے اصل عربی اور اصطلاحی معنوں میں مستعمل ہے۔ یعنی یہ معلوم ہے کہ " ایمان " کن چیزوں کو ماننے کا نام ہے؟ — اور غالباً اسی لیے اکثر مترجمین نے " ماھم بمؤمنین " کا ترجمہ " نہیں وہ ایمان لانے والے" کیا ہے بعض نے نسبتاً سلیس نثر کا خیال کرتے ہوئے " وہ ایمان والے نہیں" یا " وہ مومن نہیں ہیں" سے ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے محاورے کو ملحوظ رکھتے ہوئے " ان کو یقین نہیں ہے" اور بعض نے " وہ ایمان نہیں رکھتے" سے ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے جو اس کا ترجمہ " وہ ایمان نہیں لائے " سے کیا ہے تو یہ بلاوجہ جملہ اسمیہ کا ترجمہ جملہ فعلیہ سے کر دیا ہے۔ جو اصل عبارت سے ہٹنے والی بات ہے، اگرچہ مفہوم میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی۔

● " مَا " کی خبر پر باء (بِ) داخل ہونے سے مفہوم میں جو زور اور تاکید پیدا ہوتی ہے۔ بعض مترجمین نے اس بناء پر عبارت میں " وہ مومن ہیں ہی نہیں" کا مفہوم پاکر ترجمے میں تاکید کے لیے " ہرگز " اور " بالکل " اور " بالکل ہی" (نہیں) کا اضافہ کیا ہے جو محاورے کے لحاظ سے اصل مفہوم کو بہتر ظاہر کرتا ہے۔

● اس حصۂ آیت کے مختلف ترجموں کے اس تقابلی مطالعہ سے اور اصل (لفظی) عربی معانی کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کو اس بات کا احساس ہوتا جائے گا کہ "ترجمہ

کرنا" اور خصوصاً "معانی قرآن" کو ترجمہ میں لانا اور اس میں لفظ، محاورہ اور اصطلاح کے درمیان توازن اور اعتدال کو ملحوظ رکھنا کس قدر مشکل اور محنت طلب کام ہے۔

۲:۷:۲ ـ الاعراب

ومن الناس من یقول امنا باللہ وبالیوم الاخر وما ھم بمؤمنین

[وَ] بعض نحویوں (مثلاً عکبری) نے اسے یہاں عاطفہ قرار دے کر مابعد جملے کا عطف "الذین یومنون بالغیب ..... الآیہ (۳)" پر کیا ہے[۱] گویا وہی بیان "اقسام الناس" چل رہا ہے۔ لیکن درمیان میں جملہ مستانفہ "ان الذین کفروا... ...الآیہ (۶)" کے آجانے کے بعد اسے (آیت ۸ زیر مطالعہ کو) سابقہ آیت ۳ پر معطوف کرنے کا کوئی تُک نہیں بنتا۔ اس لیے جن حضرات (مثلاً الدرویش) نے اسے واو الاستیناف یعنی واو مستانفہ قرار دیا ہے[۲] ان کا موقف زیادہ بہتر ہے یعنی یہاں سے ایک نئے جملے اور بالکل نئی بات کا آغاز ہوتا ہے۔ تینوں جگہ (آیت ۳، ۴ پھر آیت ۶، ۷ اور اب آیت ۸ میں)، ایک الگ الگ گروہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے گروہِ مؤمنین کا، دوسری جگہ گروہِ کافرین اور تیسری جگہ گروہِ منافقین کا الگ الگ بیان ہے۔ اردو زبان میں واو عاطفہ اور واو مستانفہ دونوں کا ترجمہ "اور" ہی سے کرنا پڑتا ہے مگر مفہوم کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے (اس کی وضاحت ابھی اوپر بحث اللغۃ میں ۲:۷:۱(۱) پر ہو چکی ہے)۔ [مِنَ النَّاسِ] میں "مِن" جار اور "الناس" مجرور ہے اور یہاں "مِن" تبعیض (یعنی بعض اور کچھ کے معنی) کے لیے ہے۔ مِنْ کو آگے ملانے کے لیے "ن" پر عموماً فتحہ (ـَـ) آتی ہے۔ شاذ صورتوں میں کسرہ (ـِـ) بھی آتی ہے مثلاً "مِنِ ابْنِكَ" میں ـــ مگر "عَنْ" کو آگے ملانے کے لیے "ن" ہمیشہ مکسور ہوتا ہے جیسے "عَنِ النَّاسِ" میں۔

---

[۱] التبیان ج ۱ ص ۲۴ [۲] اعراب القرآن ج ۱ ص ۳۱

● [مَنْ] یہاں موصولہ (معرفہ) بمعنی " الذی " یا " الذین " بھی ہوسکتا ہے اس صورت میں اس (مَن) سے مراد ایسے خاص آدمی یا لوگ ہوں گے جو عہد رسالت میں یہ بات (جس کا آگے ذکر آرہا ہے) کہا کرتے تھے۔ اس صورت میں " مَن " کے بعد والی عبارت اس (مَن) کا صلہ ہے ۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس " مَن " کو نکرہ موصوفہ سمجھا جائے اور یہ زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ اس میں عموم کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں یعنی " کوئی ایسا آدمی بھی جو " یا " کچھ ایسے لوگ بھی جو "۔ اس صورت میں " مَنْ " کے بعد والی عبارت اس (مَن) کی نعت یا صفت شمار ہوگی اور " ومِنَ الناس " ایک محذوف " مبتدا نکرہ مؤخر " کی خبر (مقدم) ہوگا۔ تقدیر (UNDERSTOOD) عبارت کچھ یوں ہوگی " ومِنَ الناس فریقٌ یقول "۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہیں " فی المسجد رجلٌ "۔

● لفظ " مَن " واحد تثنیہ جمع مذکر مؤنث سب کے لیے ہوتا ہے اس لیے یہاں " مَنْ " کی لفظی صورت (جو واحد لگتی ہے) کا لحاظ رکھتے ہوئے فعل [یقول] بصیغۂ واحد غائب آیا ہے۔ اگر یہاں " یقولون " ہوتا تو بھی (عربی زبان کے لحاظ سے) درست ہوتا۔ خود قرآن کریم میں " مَنْ " کے ساتھ صلہ یا صفت کے طور پر آنے والے جملہ فعلیہ میں فعل واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً " ومنهم من یستمع الیك " (الانعام : ۲۵) اور " ومنهم من یستمعون الیك " (یونس : ۴۲) میں ۔ ان پر مفصل بات اپنے موقع پر ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

● [آمنا] میں " آمنا " فعل ماضی معروف ہے جس میں ضمیر فاعلین "نحن" مستتر ہے۔ اور یہ فعل بصیغۂ جمع یہاں " مَن " کے معنوں کے لحاظ سے آیا ہے۔ (جس طرح اوپر فعل " یقول " بصیغۂ واحد بلحاظ لفظ (مَن) آیا ہے۔ [باللہ] میں باء (بِ) تو صلۂ فعل کے طور پر آئی ہے اس لیے یہ مرکب جاری (باللہ) یہاں محلاً منصوب ہے۔ اور چاہیں تو اس جار مجرور (باللہ) کو متعلق فعل (آمنا)

قرار دے لیں اور ترجمہ میں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ [وَ] عاطفہ ہے اور اس کا عطف " باللہ" پر ہے۔ یعنی یہ دراصل " وَ آمنّا بالیوم الاخرِ" ہے [بالیوم الآخر] میں "یوم" موصوف اور مجرور بالجر (بِ) ہے اور " الآخرِ" اس کی صفت ہے لہٰذا مجرور ہے۔ ان میں علامتِ جر آخری "م" اور "ر" کا کسرہ (ـِـ) ہے۔ اور یہ پورا مرکب توصیفی اب مرکب جاری بن کر محلاً منصوب ہے یا متعلق فعل ہے۔

● [وَما ھُم بمؤمنین] ایک مکمل جملہ اسمیہ ہے جس میں ابتدائی " وَ" حالیہ (واوالحال) ہے (اگرچہ عاطفہ ہونے کا بھی بعید احتمال ہو سکتا ہے) " ما " الحجازیہ بمعنی لَیْسَ ہے۔ " مَا " کے معنی و استعمالات پر بات پہلے ہو چکی ہے [دیکھئے ۲:۲:۱(۵)] " ھُم " ضمیر غائب مذکر اور مرفوع منفصل ہے جو یہاں " مَا " کے اسم کے طور پر آئی ہے۔ اور اس " مَا " کی خبر " بمؤمنین " ہے۔ جس پر بار جارّہ (بِ) لگی ہے۔ اس آخری حصے (جملے) کے مختلف تراجم کی اوپر " اللغۃ " میں وضاحت ہو چکی ہے۔

۲:۷:۲(۱) عربی میں مبتدا، خبر یا فاعل پر بعض حروف جارہ تاکید اور زور کا معنی پیدا کرنے کے لیے لگتے ہیں۔ ان میں سے لام مفتوحہ (لَ) عموماً تاکید ایجاب یا اثبات کے لئے (کسی بات کے ضرور ہونے کے مفہوم کے لئے) اور بار مکسورہ (بِ) عموماً تاکید نفی (کسی چیز کے نہ ہونے پر زور دینے) کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ جیسے ہم کہیں " ھذا لَزیدٌ " (یہ ضرور زید ہی ہے) یا کہیں " ما ھذا بِزیدٍ " (یہ زید تو نہیں ـــ یا یہ ہرگز زید نہیں ہے)۔ نحوی عام طور پر اس " باء" کو " باء زائدہ للتوکید" یا " حرف جر زائد للتوکید" کہتے ہیں۔ یہ ایک نحوی اصطلاح ہے۔ " زائد " کے معنی " غیر ضروری" ہرگز نہیں ہوتے۔ اور ان معنوں (غیر ضروری) کے لحاظ سے قرآن کریم میں کوئی حرف یا لفظ "زائد" نہیں ہے۔ بلکہ اہل بلاغت کے نزدیک تو یہاں (آیت زیر

مطالعہ میں تاکید کے لئے اس " ب " کے بغیر چارہ نہیں۔ مطلق نفی تو "ماھم مؤمنین" (خبر منصوب) میں بھی ہوسکتی ہے۔ اور اسی بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض مترجمین نے "وہ ہرگز (یا بالکل) ایمان والے نہیں" سے ترجمہ کیا ہے۔ واو حالیہ کی وجہ سے یہاں پورا جملہ اسمیہ "وماھم بمؤمنین" حال ہو کر محلاً منصوب ہے۔

۲:۷:۳ الرسم

ومن الناس من یقول امنا باللہ وبالیوم الاخر وماھم بمؤمنین۔

اس آیت میں تمام کلمات کا رسم عثمانی اور رسم املائی یکساں ہے۔ البتہ " امنا " اور " اخر" کے شروع میں ہمزۂ مفتوحہ کو مابعد الف میں ملا کر صرف ایک الف کی شکل میں " ا " لکھنا قابلِ ذکر ہے اور اس پر ۲:۲:۳ اور ۲:۳:۴ (۱) میں بات ہو چکی ہے۔ بہر حال ان کلمات کا یہی رسم ــ کتابت مصحف اور عام عربی تحریر میں مستعمل ہے۔ اور محذوف ہمزہ کو ضبط کے ذریعے ظاہر کرنے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔

۲:۷:۴ الضبط

زیرِ مطالعہ آیت میں اختلافِ ضبط کے حسب ذیل پہلو قابلِ ذکر ہیں:۔

۱۔ ہمزۃ الوصل کی علامت کا استعمال یا ترک اور صورتِ علامت کا فرق۔ یہ چیز کلمات " الناس" ۔ " باللہ " اور "بالیوم الاخر" کے ضبط میں سامنے آئے گی۔

۲۔ ہمزۃ القطع کے لئے علامتِ قطع کا استعمال یا ترک اور علامتِ قطع کی صورت کا فرق۔ یہ فرق کلمات " امنا " ، "الاخر" اور " بمؤمنین " کے ضبط میں ظاہر ہوگا۔

۳ ۔ واو ساکنہ ماقبل مضموم پر علامت سکون کا استعمال یا اس کا ترک ۔ اس کا نمونہ " یقول " کے ضبط میں دیکھیں گے ۔

۴ ۔ یائے ساکنہ ماقبل مکسور پر علامت سکون کا استعمال یا عدم استعمال ۔ یا اس ماقبل مکسور کے نیچے کسرہ (ـِـ) کی بجائے علامت اشباع (ـٖـ) کا استعمال ۔ اس اختلاف کی مثال آپ کو " بمؤمنین " کے ضبط میں ملے گی ۔

۵ ۔ الف کے ماقبل مفتوح حرف پر فتحہ (ـَـ) کی بجائے علامت اشباع بصورت (ـٰـ) لگانا ۔ اس کا نمونہ " امنا " ، " ما " اور " الناس " کے ضبط میں سامنے آئے گا ۔

۶ ۔ لام جلالت (اللہ میں) کے اشباع کی علامت کا فرق ۔

۷ ۔ نون ساکنہ مخفاۃ کے ادغام ناقص میں حرف مدغم پر علامت سکون اور حرف مدغم فیہ پر علامت تشدید ڈالنے یا نہ ڈالنے کا فرق ۔ یہ فرق " من یقول " کے ضبط میں واضح ہوگا ۔

۸ ۔ بعض افریقی ممالک میں نون متطرفہ کے عدم اعجام کا رواج جسے آپ " من " اور " بمؤمنین " کی کتابت میں دیکھیں گے ۔

۹ ۔ افریقی ہی ملکوں میں " ق " کا بصورت " ف " لکھا جانا یہ فرق " یقول " کے لکھنے میں محسوس ہوگا ۔

۱۰ ۔ " لا " میں الف اور لام کے تعین کا فرق " الاخر " کے ضبط میں نمودار ہوگا ۔ اس طرح اس آیت میں اختلاف ضبط کی مندرجہ ذیل صورتیں سامنے آتی ہیں

وَمِنَ النَّاسِ ، مِنَ النَّاسِ ، مِنَ ٱلنَّاسِ ، مِنَ

ألنَّاسِ ، مِنَ ۠النَّاسِ

مَنْ يَّقُوْلُ ۔ مَنْ يَقُوْلُ ، مَن يَقُولُ ، مَنْ يَّفُوْلُ

امَنَّا ، امَنَّا ، ءَامَنَّا ، أٰمَنَّا ، ءَامَنَّا

(باقی ص ۶۴ پر)

قرآن کالج کے تربیتی گوشے اور صلوٰۃ کیمپ کا قیام

مرتب: لطف الرحمٰن خان (ناظم قرآن کالج)

کسی بھی تعلیمی ادارے میں اس کے تعلیمی نظام کے شانہ بشانہ اگر ایک مؤثر تربیتی نظام موجود نہ ہو تو اس کے طلبہ کی خفتہ صلاحیتیں بیدار نہیں ہو پاتیں۔ ایسے طلباء گائیڈ بکس، گیس پیپرز اور دیگر ذرائع استعمال کر کے امتحان تو اچھے نمبروں سے پاس کر لیتے ہیں لیکن عملی زندگی کے میدان میں ان کی حالت اس گاڑی کی سی ہوتی ہے، جس کا ہینڈ بریک لگا ہوا ہو اور وہ گھسٹ گھسٹ کر چل رہی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کالج میں ابتداء ہی سے طلباء کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے پر خصوصی توجّہ دی جاتی رہی ہے اور اس سال اس سمت میں کچھ مزید پیش رفت ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کالج کے بہی خواہوں کو ہم ایسے اقدامات سے وقتاً فوقتاً باخبر رکھیں۔

ٹیوٹوریل گروپس کا قیام

جنوری ۱۹۹۰ء میں کالج میں ٹیوٹوریل گروپس کا نظام رائج کیا گیا جو کہ ششماہی امتحان تک باقاعدگی کے ساتھ جاری رہا۔ ارادہ ہے کہ رمضان المبارک کی سالانہ تعطیلات کے بعد طلباء اور گروپ لیڈر اساتذہ سے اس نظام کی افادیت کے متعلق ان کی رائے معلوم کی جائے۔ پھر ان آراء کی روشنی میں اسے مزید مؤثر اور بارآور بنانے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ نظام طلباء کی

صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں ان شاء اللہ بہت ممد ہو گا۔

صلوٰۃ کیمپ کا قیام

تربیت کے نقطۂ نظر سے ایک منفرد اور اہم قدم کالج میں دو روزہ صلوٰۃ کیمپ کا قیام ہے جو ہمارے ہاسٹل وارڈن محترم میجر فتح محمد صاحب کی تحریک پر کلیتہً انہی کی زیرِ نگرانی منعقد ہُوا اور الحمدللہ بہت کامیاب رہا۔ اس کیمپ کے پروگرام کے متعلق کوئی بات کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُس اُلجھن کو رفع کر دیا جائے جو اس سلسلہ میں اکثر ذہنوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ قرآن کالج کے طلباء پنج وقتہ نماز کے پابند ہیں اور ہاسٹل میں رہائش پذیر طلباء کے متعلق تو ہم یہ بات اطمینانِ قلب کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ پانچوں وقت نماز باجماعت ادا کرتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے طلباء کے لیے صلوٰۃ کیمپ کے قیام کا مقصد اور اس کی افادیت کیا ہے؟ یہ وہ اُلجھن ہے جس کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

اس کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ چونکہ انسانی جسم مٹی سے بنا ہے۔ چنانچہ اس کی غذا بھی زمین سے ہی حاصل کی جاتی ہے۔ جبکہ انسانی جسم میں ایک چیز 'رُوح' بھی ہے جو کہ امرِ ربّی ہے۔ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ (جب میں پھونک دوں اس میں اپنی روح میں سے کچھ) کے حوالے سے انسانی روح کا تعلّق عالمِ بالا سے ہے۔ چنانچہ اس کی غذا بھی عالمِ بالا سے ہی حاصل کی جاتی ہے۔ اور نماز اس کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ جس طرح جسمِ انسانی کی صحت کے لیے ایک مرتبہ کھانا پینا کافی نہیں ہوتا، بلکہ روزانہ وقفہ وقفہ سے کچھ کھانا پینا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح رُوحِ انسانی کی صحت کے لیے روزانہ پانچ وقت کی نماز ضروری ہے۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہر طرح کی غذا جزوِ بدن نہیں بنتی بلکہ ضروری ہے کہ وہ گلی سڑی نہ ہو، HYGIENIC CONDITION یعنی طہارت اور پاکیزگی کا خیال رکھ کر پکائی گئی ہو، پوری طرح پکی ہو کچی نہ رہ گئی ہو، وغیرہ وغیرہ۔ ان شرائط کو پورا کیے

بغیر کوئی بھی غذا جسمانی صحت کی ضامن نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح نماز کی بھی کچھ شرائط ہیں جن کو پورا کیے بغیر صرف نماز روحانی بالیدگی کی ضامن نہیں ہوتی۔ اور انسان کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرکے انہیں بروئے کار لانے کے لیے صرف صحت مند جسم کافی نہیں ہے جب تک اس میں ایک صحت مند رُوح موجود نہ ہو۔

قرآن کالج کے طلباء نماز تو پابندی سے پڑھتے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ انھیں نماز کی ضروری شرائط سے آگاہ کیا جائے تاکہ ان کی نماز ان کی روحانی بالیدگی کی ضامن بن سکے۔ اِس ضرورت کے پیشِ نظر ۲۸ فروری اور یکم مارچ ۹۰ء دو دن کا صلوٰۃ کیمپ منعقد کیا گیا۔

صلوٰۃ کیمپ میں تدریسی و عملی کام کو تین بڑے حصّوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلا حصّہ فکری و علمی خطابات پر مشتمل تھا، دوسرے حصّے میں شرائط نماز وغیرہ کے متعلق گروپس کی صورت میں مذاکرے کے پروگرام ترتیب دیئے گئے تھے، جبکہ تیسرا حصّہ عملی کام سے متعلق تھا۔ فکری و علمی حصّے میں طلباء پر نماز کی اہمیت شعوری طور پر واضح کرنے کے لیے دو خطابات صدر مؤسّس محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اور دو ہی خطابات قرآن کالج کے فیکلٹی آف عربک و اسلامک اسٹڈیز کے ڈین پروفیسر حافظ محمد فاضل صاحب کے رکھے گئے تھے۔

بدھ ۲۸ فروری ۱۹۹۰ء کو صلوٰۃ کیمپ کا آغاز تلاوتِ قرآن حکیم سے ہُوا، جس کے بعد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے "فلسفۂ دین میں نماز کی اہمیت" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ اس خطاب میں محترم ڈاکٹر صاحب نے ایک بندے اور اس کے ربّ کے مابین رشتہ و تعلّق کو جوڑنے کا سب سے اہم ذریعہ نماز کو قرار دیا۔ انھوں نے قرآن حکیم کی آیاتِ بیّنات کی روشنی میں واضح کیا کہ معرفتِ باری تعالےٰ کے حصول کا اہم ترین منبع قرآن حکیم ہے اور ذکرِ الٰہی کا مؤثر ترین ذریعہ نماز ہے۔ نماز، خصوصاً تہجّد اور فجر میں قرآن حکیم کی ترتیل کے ساتھ طویل قرأت کے ذریعے قرآن حکیم بندۂ مومن کے دل پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس کا رشتہ

تعلّق اللہ تعالےٰ کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے قرآن حکیم اور نماز کے مابین ربط و تعلق کو بڑی ہی خوبصورتی سے بیان کیا اور شرکا کیمپ نے جس جذبے کے ساتھ اس کے اثرات کو اپنے اندر جذب کیا، اس کا اندازہ اُن کے چہروں کے تأثرات سے ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ انسان کے تشخّص اور دیگر مخلوقات سے اس کی افضلیت کی بنیاد وہ رُوحِ ربّانی ہے جو اس میں پھونکی گئی ہے۔ قرآن حکیم روح کی غذا ہے اور بندہ جب نماز میں قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو اس کی رُوح ترقّی حاصل کرتی ہے اور اس پر معرفتِ الٰہی کے دروازے کھُلتے جاتے ہیں ـــــ محترم ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے بعد پروفیسر حافظ محمد فاضل صاحب نے خطاب فرمایا جس میں مختلف فقہی مسالک میں اختلاف کی وضاحت کرتے ہوئے افہام و تفہیم کی ضرورت پر زور دیا۔ ان خطابات کے بعد باضابطہ تدریس کا آغاز ہُوا۔

نماز سے متعلق تدریسی مواد کو مختلف موضوعات میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ایک ایک موضوع تین تین اساتذہ کے سپرد تھا، جو بیک وقت تین مختلف گروپوں کو ایک ہی موضوع سے متعلق تعلیم دیتے اور پھر اس کا مذاکرہ کرواتے۔ تمام طلبار کو آٹھ سے دس تک کے کل نو (۹) گروپس میں تقسیم کر دیا گیا تھا اس طرح ایک ہی وقت میں تین مختلف موضوعات کی تدریس جاری رہتی۔ پیریڈ کے اختتام پر یہی گروپس دوسرے اساتذہ کے پاس چلے جاتے جو انہیں دوسرے موضوعات کی تعلیم دیتے اور ان کا مذاکرہ کرواتے۔ اس طرح ہر گروپ نے تمام موضوعات کی تعلیم مکمل کی۔ تعلیم اور مذاکرہ کا یہ پروگرام نماز ظہر تک جاری رہا۔

نماز عصر تا عشاء کے دوران عملی کام (PRACTICLES) کے پیریڈ رکھے گئے تھے۔ عملی کام وضو کا طریقہ، نماز کی ادائیگی، نماز باجماعت کا طریقہ، ہر طالب علم سے نماز کی سماعت اور ترجمۂ نماز کی تعلیم وغیرہ پر مشتمل تھا۔ ان پیریڈز میں طلبار حاصل کردہ علم پر عمل کر کے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح کرتے۔

پہلے روز کی طرح دوسرے روز کے پروگرام کا آغاز بھی تلاوت قرآن حکیم

اور اس کے بعد اجتماعی خطابات سے ہُوا۔ پہلے پروفیسر حافظ محمد فاضل صاحب نے "نماز کے بارے میں قرآن و حدیث کے احکام اور صحابہ رضؓ کا طرزِ عمل" کے موضوع پر طلباء سے خطاب کیا۔ اس کے بعد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے "طالبانِ قرآن اور خادمانِ دین کے لیے نماز کی خصوصی اہمیت" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ انہوں نے نماز کی اہمیت پر اُس حدیثِ قدسی کی روشنی میں اظہارِ خیال کیا جس میں بندے کو نماز میں سورۃ الفاتحہ کی ایک ایک آیت پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب مرحمت ہونے کی نوید سنائی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کی اصطلاحات کے حوالے سے واضح کیا کہ نماز میں انائے صغیر، انائے کبیر کے رُوبرو ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جس طرح ایک بندۂ مسلم کی پوری زندگی کے معمولات میں نماز کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اسلامی معاشرے میں نظامِ صلوٰۃ کو پورے معاشرتی نظام کے محور کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

اجتماعی خطابات کے بعد طلباء پہلے روز کی طرح گروپس میں تقسیم ہو کر درس و تدریس اور مذاکرہ میں مصروف ہو گئے۔ یہ سلسلہ ٹائم ٹیبل کے مطابق نماز ظہر تک جاری رہا۔ صلوٰۃ کیمپ میں دو دن جن موضوعات کی تعلیم اور مذاکرہ ہوتا رہا ان میں اوقاتِ نماز، شرائطِ نماز، نماز کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات اور مفسدات وغیرہ، فرض اور نفل نمازیں، نمازِ جمعہ، صلوٰۃِ مریض، صلوٰۃِ مسافر اور احکامِ مساجد خصوصی اہمیت کے حامل تھے۔

مزید برآں اس کیمپ میں گاہے بگاہے اتباعِ سنّت کی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا اور طلباء کو روزمرّہ کے معمولات مثلاً کھانے پینے اور سونے وغیرہ کے مسنون آداب کی تعلیم دی گئی۔

دوسرے روز نمازِ عصر کے بعد کوئز پیپر (QUIZ PAPER) کے ذریعے کیمپ میں شریک طلباء کا ٹیسٹ لیا گیا۔ نمازِ مغرب کے بعد میجر فتح محمد صاحب کے اختتامی کلمات کے ساتھ یہ دو روزہ صلوٰۃ کیمپ بخیر و خوبی اختتام پذیر ہُوا۔

خلاصہ کلام

ہمیں اعتراف ہے کہ قرآن کالج ہی کی طرح اس کا تربیتی نظام بھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے۔ اسے مؤثر اور بار آور بنانے کے لیے گہرے غور و فکر کے ساتھ ساتھ پُرخلوص جذبہ اور لگن کی ضرورت ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ یہ کام عملِ پیہم اور جہدِ مسلسل کا متقاضی ہے۔ چنانچہ اس کام کا آغاز ہم نے اس عزم کے ساتھ کیا ہے کہ خوب سے خوب تر کی تلاش کا سفر ان شاء اللہ تعالےٰ جاری رہے گا۔ اس لیے کہ ع "جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے"۔ اس نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے اہلِ علم حضرات اور کالج کے بہی خواہوں کی جانب سے ان کی تجاویز اور ان کی رہنمائی کا ہم خیر مقدم کریں گے۔

السعی منّا والاتمام من اللہ

بقیہ : لغات و اعرابِ قرآن

بِاللّٰهِ ، بِاللَّهِ ، بِّاللَّهِ ، بْاللّٰهِ

وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ، بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ، بِّالْيَوْمِ الْأٰخِرِ ،

بْالْيَوْمِ اٰلْاٰخِرِ

وَمَا ، لَمَا ، مَا

هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ، بِمُؤْمِنِيْنَ ، بِمُؤْمِنِيْنَ ،

بِمُؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ میثاق کے ۶۸-۱۹۶۷ء کے اداریوں پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد

کی ایک اہم تالیف:

اسلام اور پاکستان

جسے بجا طور پر تحریکِ پاکستان کے تاریخی و سیاسی پس منظر اور اسلامیانِ پاکستان کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر پر ایک جامع و مربوط دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔

نیا ایڈیشن، نئی خوبصورت کتابت اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

قیمت: اعلیٰ ایڈیشن (مجلد) -/۴۰ روپے اشاعتِ عام: -/۵ روپے

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور

MAY 1990

Regd No. L. No. 8193

MONTHLY

HIKMAT_E_QURAN

LAHORE

VOL. 9

NO. 5

صدرِ مؤسس مرکزی انجمن خدّام القرآن اور امیرِ تنظیمِ اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی علمی و فکری اور دعوتی و تحریکی کاوشوں کا نچوڑ

۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی دستاویز جس میں عملی خطوط کی نشاندہی بھی موجود ہے

دعوت
رجوع اِلی القرآن
کا منظر و پس منظر

چھپ کر آگئی ہے ــــ ضرور مطالعہ کیجئے ــــ دُوسروں تک پہنچائیے

■ سفید کاغذ ■ عمدہ کتابت ■ دیدہ زیب طباعت ■ قیمت مجلّد/۶۵ روپے ■ غیر مجلّد/۵۰ روپے